ONE
RUPEE
بہترین کہانیاں

بہترین کہانیاں

بچّوں کے لیے

۱۹۷۶

فہرست

ایک اُسترے کی کہانی

احمد ندیم قاسمی

اگر میں چاہوں تو اس کہانی کو ایک ہزار سال پہلے سے شروع کر دُوں۔ چاہوں تو آج سے شروع کر دُوں اس لیے کہ یہ کہانی ہر زمانے میں سچی ہے۔ میں نے یہ کہانی اپنی نانی سے سُنی تھی جنھوں نے اپنی نانی جان سے سُنی ہو گی اور انھوں نے اپنی نانی جان سے۔ یہ اتنی پرانی کہانی اتنی نئی کیوں ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس

میں ایک سچائی بیان کی گئی ہے اور سچائی پرانی ہوتی ہے نہ نئی۔ سچائی صرف سچائی ہوتی ہے۔

وہ لوگ جو محنت نہیں کرتے، جو ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر زندگی گزارنا چاہتے ہیں، جنھیں لمبی تان کر لیٹنے اور دیر تک لیٹے رہنے میں لطف آتا ہے اس اُسترے کی طرح ہیں جس کی یہ کہانی ہے۔

یہ اُسترا ایک گاؤں کے نائی کا تھا۔ وہ اس چمکتے ہوئے تیز اُسترے سے کسانوں کی حجامت بناتا تھا۔ کسانوں کے چہرے پر نہ کریمیں لگتی ہیں اور نہ لوشن۔ اس لئے ان کے بال موٹے موٹے اور سخت ہوتے ہیں۔ گاؤں کے نائی حجامت بنانے سے پہلے بالوں پر نہ صابن ملتے ہیں نہ برش چلاتے ہیں۔ وہ تو چٹکیوں کو پانی سے بھگو کر لوگوں کے چہروں کی چٹکیاں لیتے ہیں جن کی انہیں حجامت بنانی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس استرے کو دِن بھر بہت محنت کرنا پڑتی تھی۔ اس کی دھار کو لوہے کے تار ایسے بالوں میں سے گزرنا پڑتا تھا اور وہ تھک جاتی تھی۔ مگر نائی بڑا سیانا اور بہت نرم دل تھا۔ وہ ایک پتھر یا لکڑی کے ایک ٹکڑے کو پانی سے بگھو کر

اُسترے کو دائیں بائیں تھپکیاں دیتا تھا۔ یوں اُسترے کی چمک بھی اٹھتی تھی اور تازہ دم بھی ہو جاتی تھی۔ پھر جب نائی دِن بھر کا کام ختم کر لیتا تھا تو اُسترے کو بند کر دیتا تھا اُسترا اپنے دستے کے بستر پر سو جاتا تھا اور رات بھر کے آرام کے بعد صبح کو پھر محنت مزدوری شروع کر دیتا تھا۔

ایک دن گاؤں کا یہ نائی اپنی کسوت لیے کہیں جا رہا تھا۔ کسوت پھٹی ہوئی تھی۔ اُسترے نے جو باہر کھسکنے کا راستہ دیکھا تو اپنے دستے سے الگ ہونے کے لیے خوب زور لگایا۔ آخر وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہو گیا۔ دستہ کسوت میں رہ گیا اور اُسترے کا پھل نرم نرم گھاس پر آ گرا۔ نائی بے چارے کو کیا پتا تھا کہ اس کا پیارا اُسترا اس سے بے وفائی کر گیا ہے۔ وہ اپنی راہ چلتا رہا۔ ایک جگہ اسے ایک کسان کی حجامت بنانا تھی اس نے کسوت کو کھول کر اُسترا نکالنا چاہا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ دستہ پڑا ہے اور اُسترا غائب ہے۔ اس کا کُل سرمایہ یہی ایک اُسترا تھا۔ وہ دن بھر اس راستے پر بھٹکتا رہا جہاں سے گزرا تھا۔ ایک بار اس کا پاؤں بھاگتے ہوئے اُسترے کے بالکل پاس پڑا۔ ڈر کے مارے اُسترے کی جان ہی تو نکل گئی۔

مگر پھر نائی آگے بڑھ گیا اور اُسترا دھوپ میں ہنسنے لگا۔

خوب ہنس لینے کے بعد اُسترے نے کو اپنے جسم کو دیکھا تو یہ معلوم کر کے اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی کہ اس کے انگ انگ سے کرنیں پھوٹ رہیں ہیں۔ سورج آسمان پر چمک رہا تھا اور اُسترے کی چمکتی دمکتی سطح پر اس کا عکس پڑ رہا تھا۔ اپنی دھار دیکھ کر تو اُسترے کو ایسا لگا جیسے تارا ٹوٹ رہا ہے۔ اپنے جسم پر جہاں بھی اس کی نظر پڑتی تھی کئی سورج جگمگاتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔

اس نے سوچا۔ "ارے! میں تو بڑا ہی خوبصورت ہوں کہ مجھے دیکھ کر خود سورج کی آنکھیں چندھیا رہی ہوں گی۔ میں کتنا خوش قسمت ہوں کہ نائی کی قید سے بھاگ آیا ہوں۔ وہاں مجھے اتنی محنت کرنی پڑتی تھی کہ دانتوں پسینا آجاتا تھا۔ مجھے اتنا وقت ہی نہیں ملتا تھا کہ میں اپنے آپ کو دیکھ سکوں۔ یہاں میں کتنے آرام میں ہوں۔ نہ کام ہے نہ کاج۔ مزے سے لمبا لمبا لیٹا ہوا ہوں۔ سورج میرے جسم میں اپنی صورت دیکھ رہا ہے۔ ہوا میری سطح پر کھیل رہی ہے۔ آس پاس کی گھاس جھک جھک کر مجھ میں جھانکتی ہے۔ ابھی ابھی کتنی پیاری سی تتلی مجھے آئینہ سمجھ

کر پرَ سنوارتی رہی۔ ہر کوئی اُٹھانے والا نہ بند کرنے والا۔ میری تو دُعا ہے کہ قیامت تک یہیں پڑا رہوں۔ آرام مِلا تو خوب موٹا تازہ ہو جاؤں گا اور بڑے مزے آئیں گے۔

یہ کہنے کے بعد اُسترے نے سوچا کہ اگر میں یہاں پڑا رہا تو ہو سکتا ہے کبھی کوئی آدمی میری چمک دمک کو دیکھ لے، مجھے اٹھا کر گھر لے جائے اور وہاں مجھے قید کر دے۔ اس لیے وہ وہاں سے کھسکا۔ ایک بِل میں گُھس گیا اور برسوں کی تھکن دُور کرنے کے لیے سو گیا۔

اُسترا اچھ سات مہینے تک سوتا رہا۔ بارشیں ہوئیں۔ پانی اس کے بل میں گھس آیا مگر جب بھی اس کی آنکھ نہ کھلی۔ کئی کیڑے مکوڑے اس پر سے گزرے مگر اسے کھجلی تک محسوس نہ ہوئی۔ اس نے کروٹ تک نہ بدلی۔ جس رُخ سویا تھا اسی رُخ اٹھا۔ سوچا، چلو ذرا سی ہوا خوری کر لیں۔ آ کر پھر سو رہیں گے۔ آخر ہمیں اور کون سا کام کرنا ہے!

وہ بل میں سے کودا اور باہر آ گیا۔ سورج اسی طرح چمک رہا تھا۔ ہوا اسی طرح چل

رہی تھی۔ گھاس کی پتّیاں اسی طرح ہل رہی تھیں۔ اُسترے نے مسکرانے کی کوشش کی مگر اس کے ہونٹ جڑ گئے تھے۔ اس نے گھبرا کر اپنے جسم پر نظر دوڑائی تو وہاں اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ سر سے لے کر پاؤں تک اس پر زنگ چڑھ چکا تھا۔ سورج کی کرنیں اس سے دور رہتیں۔ اُس کی تمام چمک ماند پڑ چکی تھی۔

اس نے سوچا کہ گھاس مجھ سے ڈر ڈر کر دوسری طرف دیکھنے لگتی ہیں۔ سورج کی کرن مجھے چھوتے ہی بھاگ کھڑی ہوتی ہے۔ کاش! میرا نائی ایک بار ادھر سے گزرے اور میں اچھل کر اس کی کسوت میں جا بیٹھوں اور خوب محنت کروں اور میری چمک دمک مجھے واپس مل جائے۔

لیکن ایسا نہ ہوا اور وُہ اُسترا وہیں پڑا گلتا سڑتا رہا۔ وہ لوگ جو محنت نہیں کرتے، جو ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر زندگی گزارنا چاہتے ہیں، جنھیں لمبی تان کر لیٹنے اور دیر تک لیٹے رہنے میں لطف آتا ہے اُن کا انجام ایسا ہی ہوتا ہے۔ اسی لیے تو کہتے ہیں۔ محنت میں عظمت ہے۔

میری کہانی

میرزا ادیب

کسی نے جو کہا ہے کہ زندگی پھولوں کی سیج نہیں تو درست ہی کہا ہے۔ زندگی پھولوں کی سیج بھی ہے اور کانٹوں کا بستر بھی۔ مطلب یہ کہ زندگی میں دُکھ ہی دُکھ نہیں سُکھ بھی ہے۔ دُنیا میں کوئی انسان ایسا نہیں ہے جس کی زندگی میں

صِرف دُکھ ہو اور سُکھ نہ ہو۔۔۔ سُکھ ہو اور دُکھ نہ ہو! واقعہ یہ ہے کہ اگر دُکھ نہ ہو تو سُکھ کا بھی مزا نہیں ہے۔ تم نے کبھی نہ کبھی میٹھے چشمے کا پانی ضرور پیا ہو گا۔ فرض کرو یہ چشمہ تمہارے گھر کے عین سامنے ہے۔ چند قدم چل کر پانی پی لیتے ہو کیا لطف ہے اس طرح میٹھا پانی پینے میں۔ اصل لطف میٹھے پانی کا اس وقت آتا ہے جب تم کہیں دُور سے تھک تھکا کر آؤ۔ پیاس زور سے لگی ہو۔۔۔ اس وقت چشمے کے کنارے پہنچ کر کے پانی کا گلاس اپنے ہونٹوں سے لگاؤ تو ایسا مزا آتا ہے کہ بیان ہی نہیں ہو سکتا۔

میں تمہیں ایک ایسا واقعہ سناتا ہوں، جس ہیں تلخی بھی ہے اور مٹھاس بھی۔ ہوا یوں کہ میں ایک مرتبہ سکول سے آتے ہوئے گھر کا راستہ بھول گیا۔ میں ایک درخت کے نیچے کھڑا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کیا کروں، کِس طرح گھر جاؤں اور کس سے مدد مانگوں کہ راہ بھُول کر اِدھر آ نِکلا ہوں۔

تم کو ایسا تجربہ ہوا ہے کبھی؟ ممکن ہے ہوا ہو۔ اور نہیں بھی ہوا تو کیا حرج ہے۔ تم سوچ تو سکتے ہو نا۔ یہ ضروری نہیں کہ آدمی اُسی بات کو سمجھ سکے جس کا تجربہ ہو

چکا ہو اور اس کا بالکل اندازہ نہ کر سکے جس کا اسے تجربہ نہ ہو! سوچ بھی تو ایک بہت بڑی چیز ہے۔ خیر مجھے اپنی کہانی سنانی چاہیے۔ تو ایسا ہوا کہ میں نے اُس وقت دُور سے ایک آدمی کو آتے دیکھا۔ وہ ادھر ہی آ رہا تھا جدھر میں کھڑا تھا۔ شاید اس نے مجھے دیکھ لیا ہو۔ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا تھا۔ میں درخت کے نیچے اس طرح چھپ کر کھڑا تھا کہ قریب سے گزرنے والا بھی مجھے مُشکل سے دیکھ سکتا تھا۔ وہ آیا۔۔۔ اور قریب آ گیا۔ اور بالکل میرے سامنے پہنچ گیا۔ پہلے تو میں چُپ چاپ کھڑا تھا اور اب جو آدمی کو آتے دیکھ تو رونا شروع کر دیا۔ اور رونا اس لئے شروع کر دیا کہ وُہ مُجھے دیکھ لے اور میرے پاس آ جائے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ وہ آ گیا میرے پاس۔ اس کے الفاظ اب تک مجھے یاد ہیں۔ کہنے لگا۔

"روتے کیوں ہو میاں!" اس کے لہجے میں بڑی نرمی تھی۔

پتا نہیں میں نے کیا کہا۔ یہی کہا ہو گا کہ گھر کا راستہ بھول گیا ہوں اور کیا کہہ سکتا تھا۔ ہاں بھئی یہ بات تو تمہیں بتانا بھول ہی گیا کہ اب بارش کا آغاز بھی ہو چکا تھا۔ تیز بارش نہیں تھی۔ ایسی بارش تھی جسے ہم بوندا باندی کہتے ہیں۔ اس نے لمبا سا

کوٹ پہن رکھا تھا۔ بڑی مہربان شکل تھی اُس کی۔ اُس نے مُنہ سے کُچھ نہ کہا۔ میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کوٹ کے بٹن کھول کر مُجھے اس کے اندر لے لیا۔ مُجھے خوب یاد ہے کہ چند قدم چلنے کے بعد میرا بستہ ہاتھ سے گِر پڑا۔ اس نے یہ بستہ اٹھا کر اپنی بغل میں داب لیا۔

میں کدھر جا رہا ہوں؟ کوئی خبر نہیں مجھے۔ یہ شخص کون تھا؟ میں کیسے جان سکتا تھا!

وُہ چلتا گیا۔ میں بھی چلتا گیا۔ ہم دونوں چلتے گئے اور ہلکی ہلکی بارش ہوتی رہی۔ بادل گرجتا اور بجلی چمکتی رہی۔

ہم کتنی دیر کے بعد ایک مکان میں پہنچے تھے۔ یہ بات میں اب بھول گیا ہوں۔ جس کمرے میں وہ شخص مجھے لے آیا تھا بڑا خوبصورت کمرہ تھا۔ ایک طرف آرام کرسی پر ایک عورت بیٹھی تھی۔ اس آدمی نے مجھے ایک کرسی پر بٹھا دیا اور کوٹ اُتار کر اس عورت کو دیا۔ عورت بڑے غور سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ کوٹ لیتے ہوئے اُس نے جھُک کر میری جانب دیکھا اور پھر کوٹ اُٹھا کر پردہ ہٹا

کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ وُہ شخص بھی اس کے پیچھے چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد دونوں آئے تو وُہ عورت اب میری طرف دیکھ کر مُسکرا رہی تھی۔ اس نے ایک پلیٹ اُٹھا رکھی تھی جس میں طرح طرح کے بسکٹ پڑے تھے۔ وہ میرے پاس آ کر بیٹھ گئی اور کہنے لگی۔

"اچھا تو تُم راستہ بھول گئے ہو۔ اوہو! کوئی بات نہیں۔ دیکھو! میں جب تُمہاری عُمر کی تھی نا تو ہر روز راستہ بھول جاتی تھی۔ کبھی کِسی جنگل میں پہنچ جاتی تھی۔ کبھی کسی بازار میں۔ سچ مُجھے تو بڑا مزا آتا تھا راستہ بھول جانے میں۔۔۔ جی چاہتا ہے اب بھی راستہ بھُول جایا کروں!" یہ کہتے ہوئے وہ ہنس پڑی۔

پہلے پہل تو میں نے اُس کی باتوں میں کوئی دلچسپی نہ لی۔ ڈر ابھی دِل سے نِکلا کب تھا اور پھر وہ عورت بالکل اجنبی تھی۔ اجنبی لوگوں سے مانوس ہونے میں کچھ نہ کچھ دیر تو لگتی ہے نا! وُہ مجھ سے باتیں کرنے لگی۔ کون سی جماعت میں پڑھتے ہو؟ کیا نام ہے تمہارا؟ ابّا جی کیا کام کرتے ہیں؟ ایسے نہ جانے کتنے سوال کر ڈالے۔ اُس نے۔۔۔ میں کبھی جواب میں رو پڑتا تھا اور کبھی خاموشی سے اُس کا مُنہ دیکھنے

لگتا تھا۔ اُس کا شوہر (وُہ شوہر ہی تو ہو گا اس کا) بھی وہیں آ گیا تھا۔ وُہ بھی ان باتوں میں شامل ہو گیا تھا۔ دونوں بڑی محبّت، بڑے پیار سے باتیں کر رہے تھے اور میری جھجک اور خوف آہستہ آہستہ دُور ہوتا جا رہا تھا۔ عورت نے بار بار اصرار کر کے مجھے بسکٹ کھلائے، دودھ پلایا اور تھوڑی دیر بعد پھل بھی منگوا لیا۔ ویسے تو دونوں کی باتوں میں بڑی مٹھاس تھی مگر عورت کی آواز میں خاص طور پر بڑی شفقت، بڑی ملائمت اور بڑی محبّت تھی۔

نہ جانے یہ باتیں کب تک جاری رہیں۔ آہستہ آہستہ میری پلکیں جھپکنے لگیں۔ نیند آ گئی آنکھوں میں۔ اُس نے بازوؤں سے اُٹھا کر مُجھے ایک پلنگ پر لٹا دیا۔

صُبح جاگا تو نے اپنے سامنے دو آنکھیں دیکھیں جو مُجھ پر جھُکی ہوئی تھیں۔ ان آنکھوں میں بے پناہ پیار، بے پناہ شفقت تھی۔ ”جاگ اُٹھے بیٹا؟“ عورت نے کہا۔

میں نے اِرد گرد نظر ڈالی تو اچانک اجنبی ماحول کا احساس کر کے مُجھے یاد آ گیا کہ میں گھر کا راستہ بھول کر اِدھر آ نِکلا ہوں اور شاید میں کُچھ گھبرا گیا۔

”تمہارے گھر کا پتا مل گیا ہے۔ ناشتے کے بعد وُہ چھوڑ آئیں گے تمہیں۔“ اس نے اپنے ہاتھ سے میرا مُنہ دھویا صابن مل کر۔ بال سنوارے اور پھر میز پر لے آئی۔ ناشتا کروایا اور جب میں فارغ ہو گیا تو نیچے لے آئی۔ وہاں اس کا شوہر کھڑا شاید میرا انتظار کر رہا تھا۔

میں کمرے سے باہر نکلنے لگا تو اس نے بڑی شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہنے لگی۔

”اب کبھی راستہ بھُول جاؤ تو اِدھر آ جانا۔“

یہ ایک عام سا واقعہ ہے مگر میں اسے اب تک نہیں بھُول سکا۔ وہ پہلا موقعہ تھا جب مُجھے اس چیز کا احساس ہوا جسے اِنسانی محبّت کہتے ہیں۔ ہم انسان ایک دوسرے سے محبّت کرتے ہیں۔ کم بھی اور زیادہ بھی اور یہ محبّت اس وجہ سے ہوتی ہے کہ جس سے محبّت کی جاتی ہے وہ یا تو کوئی رشتہ دار ہوتا ہے یا دوست۔ ہم میں ایک تعلّق ہوتا ہے، تعلّق کے بغیر کہاں محبّت ہوتی ہے لیکن جب کوئی اجنبی شخص کسی اجنبی کے آرام کا خیال کرے، اس کی خاطر تواضع کرے تو یہ

ہوتی ہے سچّی محبت۔ کیونکہ اِس سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔

مُجھے جب کبھی ناخوشگوار واقعات گھیرتے ہیں اور میری زندگی میں تلخیاں بھر جاتی ہیں تو اس واقعے کی یاد ایک میٹھا چشمہ بن جاتی ہے جس سے میرے دل و دماغ میں مٹھاس سی آجاتی ہے اور میرے سردولولے پھر تازہ ہو جاتے ہیں۔

جس دُنیا میں ایسے اجنبی ملتے ہوں جو بغیر کسی غرض کے، بغیر کسی فائدے کے سچّی محبّت کریں، سچّا پیار دیں۔ وُہ دُنیا بھلا رہنے کے قابل کیوں نہیں ہے۔ جس زندگی میں تلخیوں کے باوجود میٹھے چشمے بھی ہوں۔۔۔ اُس زندگی میں لطف، کیوں نہیں ہے؟

طرح دار خان

حسن عابدی

نام تو اُن کا کُچھ اور تھا، لیکن ہم انہیں میاں طرح دار کہتے تھے۔ بے تکلّفی زیادہ بڑھی تو صرف طرح دار کہنے لگے۔ شروع میں تو وہ بہُت بھِنّائے لیکن بعد میں خود بھی اس نام سے مانوس ہو گئے۔ سکول میں، ہوسٹل میں، بازار میں، دوستوں کی محفل میں، غرض کہ ہر جگہ وہ اِسی نام سے پکارے جاتے تھے۔

سردیوں کے دن تھے۔ ہم چار پانچ ہمجولی ہاسٹل کے لان میں بیٹھے دھوپ سینک رہے تھے کہ اچانک گیٹ کھُلا۔ ایک حضرت دو قلیوں کے ہمراہ داخل ہوئے۔ بکس، بستر، کتابیں اور بہت ساراالُم غلّم دو قلیوں کے سر پر دھرا تھا۔ قلیوں نے سامان بر آمدے میں ڈالا، اور صاحبزادے کو سلام کر کے رُخصت ہو گئے۔ یہ میاں طرح دار تھے۔

میاں صاحب ذرانکلتے ہوئے قد کے دھان پان سے آدمی تھے۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں، لمبی ناک اور بڑے بڑے کان، اُن کے لمبوترے چہرے پر کُچھ عجیب سے لگتے۔ خیر شکل صُورت سے کیا ہوتا ہے، لیکن میاں طرح دار کی جو ادا ہمیں پسند آئی وُہ اُن کی طرح داری تھی۔ خاندانی رئیس ہونے کے سبب سے، ابتدائی تعلیم گھر پہ ہی پائی تھی اور آٹھویں جماعت میں داخل ہو کر پہلی بار شہر تشریف لائے تھے۔

میاں طرح دار کو اپنے قد کاٹھ پر بڑا ناز تھا۔ اپنی خاندانی بڑائی اور ریاست پر بڑا ناز تھا۔ بہادری کا ذکر ہوتا تو میاں طرح دار فوراً اپنا تذکرہ لے کر بیٹھ جاتے۔

دولت کی بات ہوتی تو اپنی جاگیر کا طول و عرض ناپنے لگتے۔ ذہانت اور چالاکی میں تو اُن کا کوئی جواب ہی نہ تھا۔ لڑکے میاں صاحب کی باتوں سے انکار کو گناہ سمجھتے اور ان کے ہر دعوے پر اس طرح سر ہلاتے جیسے سر ہلانے میں دیر کی تو آسمان پھٹ پڑے گا۔ اور میاں طرح دار ایسے بھولے کہ ہمجولیوں کی ان باتوں کو بالکل سچ جانتے تھے۔

چار لڑکے برآمدے میں بیٹھے سردی سے ٹھٹھر رہے ہیں اور آگ سینک رہے ہیں۔ کسی نے کہا۔ "یارو! سخت سردی ہے" اور میاں طرح دار نے پاس سے گزرتے ہوئے یہ فقرہ سُن کر اچکن اُتار دی۔ لڑکوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں سکیم تیّار کر لی اور میاں صاحب کو گھیر کر بٹھا دیا۔ اب میاں طرح دار ہیں کہ سردی سے ٹھٹھر رہے ہیں، لیکن بہادری کے مارے نہ اچکن پہنتے ہیں نہ انگیٹھی کے قریب آتے ہیں۔ بدن میں کپکپی ہے اور زبان میں لُکنت، ہونٹوں پر نیلاہٹ اور آنکھوں میں آنسو لیکن میاں صاحب اس حالت میں بھی اپنے کارنامے سنائے جا رہے ہیں۔ "یہ کیا سردی ہے۔ سردی تو ہمارے گاؤں میں پڑتی ہے کہ

دن میں رات کا سماں ہوتا ہے۔ برف پڑ رہی ہے۔ آنگن میں برف، دیواروں پر برف، میدانوں اور کھیتوں میں برف، پانی میں برف کھانے میں برف، بستر میں اور بستر کے تکیے میں برف۔ لیٹے لیٹے، تکیے کے نیچے ہاتھ ڈالا، ایک مُٹھّی برف لی اور مزے سے چر چر چبا رہے ہیں۔"

ہوسٹل کے شریر لڑکے یہ حکایتیں سُنتے اور ہنسی ضبط کرنے کی کوشش میں بے حال ہو جاتے۔ اور جوں ہی میاں طرح دار رُخصت ہوتے لڑکے ہنس ہنس کر دُہرے ہوئے جاتے بلکہ زخمی پرندے کی طرح برآمدے کے ننگے فرش پر دیر تک تڑپتے رہتے۔

میاں طرح دار عام لڑکوں سے بالکل الگ تھے۔ کپڑے بڑے ٹھاٹ کے پہنتے۔ کھانے کی اچھی اچھی چیزیں گھر سے منگواتے اور پیسے تو بگڑے ہوئے رئیسوں کی طرح مُٹھّی بھر بھر کے خرچ کرتے۔ یہی نہیں بلکہ میاں صاحب جب کپڑے پہن کر اصیل مُرغ کی طرح اپنے کمرے سے اکڑتے ہوئے نکلتے تو ہمجولیوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر ملتے اور جتا دیتے کہ خُوش پُوشی مجھ پر ختم ہے۔ تُم لوگ بھلا کیا

ہو۔

لڑکے میاں طرح دار کے چھچھورے پن پر جی ہی جی میں کُڑھتے، لیکن میاں صاحب کو بیوقوف بنا کر اور اُن کی حرکتوں پر دِل کھول کر ہنس لینے کے بعد اُنہیں مُعاف بھی کر دیتے تھے۔ ایک کہتا: ”یار طرح دار! یہ اچکن کا کپڑا کہاں سے خریدا؟“ بس اس سوال پر وُہ پھُول کر کُپّا ہو جاتے اور کہتے: ”ولایت کے ایک کارخانے دار نے والد کو تحفے میں بھیجا تھا۔ یہی تین گز کپڑا تھا جو اس کارخانے میں تیّار ہوا پھر مشین ٹوٹ گئی اور کپڑا بُننا بند ہو گیا۔ لاہور کے عجائب گھر والے مہینوں پیچھے پڑے رہے کہ ہمیں دے دیجیے۔ عجائب گھر میں رکھیں گے، لیکن ہم نے انکار کر دیا۔“

”بہت اچھّا کیا۔“ کوئی شریر لڑکا بیچ میں ٹپک پڑتا۔ ”اور اب تو اسے عجائب گھر میں رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ تمھیں بھی وہیں رہنا پڑے گا۔“

لڑکے کھِلکھلا کر ہنس دیتے اور میاں طرح دار کُچھ نہ سمجھتے ہوئے بھولپن سے کہتے: ”اور نہیں تو کیا۔“

گرمیوں کا موسم آ گیا تھا۔ امتحانات قریب تھے۔ محفلیں سُونی ہو گئیں۔ ہوسٹل کے کھلنڈرے لڑکوں نے بھی کتابیں جھاڑ پونچھ کر سامنے رکھ لیں اور پڑھائی میں جُٹ گئے۔ البتّہ شام کو تھوڑی دیر کے لیے کھیل کے میدان میں رونق نظر آتی اور چاندنی راتوں میں تو اکثر رات گئے گھُومنے پھرنے کا پروگرام بن جاتا۔

میاں طرح دار لکھنے پڑھنے کے کُچھ ایسے شوقین نہ تھے۔ گھر میں اللہ کا دیا سب کُچھ تھا پھر کتابوں میں کیوں سر کھپاتے۔ اس لیے ان دنوں بیچارے بہت اُداس رہنے لگے تھے۔ لڑکے تو پڑھائی میں مصروف تھے آخر وہ کہاں جاتے۔ کِس کے پاس بیٹھتے اور بڑائی کے قصّے کِسے سُناتے؟ ایک شام کا قصّہ ہے شریر لڑکوں کی ٹولی ہوسٹل کے لان میں بیٹھی تھی۔ میاں طرح دار ٹہلتے ٹہلتے اُن کے درمیان جا پہنچے۔ کوئی لڑکا اپنے گاؤں کے ڈاکوؤں کا قصّہ سُنا رہا تھا۔ طرح دار کو خود پر قابو کہاں۔ جھٹ اپنی بہادری کے قصّے لے بیٹھے۔۔۔ ”یوں گھوڑی پر سوار ہو کر نِکلا۔ یُوں دریا پار کیا۔ درخت پر چڑھ کر چھلانگ لگائی۔ ڈاکوؤں کو مار بھگایا۔“ اور اسی طرح کی اُلٹی سیدھی باتیں کرنے لگے۔

لڑکے سخت بے مزہ ہوئے۔ آخر اُن میں سے ایک بولا: "یارو! چودھری کے باغ میں آم پکے ہیں اور ہم یہاں آموں کو ترس رہے ہیں۔ بڑے شرم کی بات ہے۔ کیا کوئی ایسا جوان مرد نہیں جو چودھری کے باغ سے آم توڑ کر لائے؟"

میاں طرح دار نے سینے پر ہاتھ مارا اور اکڑ کر بولے: "میں حاضر ہوں۔ چلو میرے ساتھ۔"

لو صاحب! ایک پَل میں ساری سکیم تیّار ہو گئی۔ رات کے گیارہ بجے تھے۔ ہر طرف چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ چاند کبھی بادلوں میں چھُپ جاتا تو گھُپ اندھیرے کا عالم ہو جاتا۔ ہوسٹل کا گیٹ کب کا بند ہو چکا تھا۔ چوکی دار دیوار کے قریب چار پائی پر لیٹا میٹھی نیند کے مزے لوٹ رہا تھا۔ البتّہ چوکی دار کا کُتّا کبھی کبھی سوتے سے چونک کر اُٹھتا اور چاند کی طرف مُنہ کر کے سائرن کی آواز میں "بھو اُووو" کرنے کے بعد پھر اُونگھنے لگتا۔

لڑکوں کی ٹولی دیوار پھلانگ کر ہوسٹل سے باہر نِکلی اور آموں کے باغ کی طرف، جو مُشکل سے ایک فرلانگ تھا، روانہ ہوئی۔ میاں طرح دار سب سے آگے تھے۔

البتّہ جب چاند بدلیوں میں چھُپ جاتا اور کہیں قریب سے کتّوں کے بھونکنے کی آواز آتی تو میاں صاحب دُبک کر پیچھے ہو جاتے اور خوف سے کانپ اُٹھتے۔ اسی طرح یہ لوگ باغ کے اندر جا پُہنچے۔

چاندنی آم کے گھنے باغ میں یوں پھیلی ہوئی تھی جیسے کِسی نے شیشے کے ٹکڑے اِدھر اُدھر بکھیر دیے ہوں۔ باغ کا چوکی دار اپنی جھونپڑی میں پڑا سو رہا ہو گا۔ لڑکوں نے سرگوشی میں مشورے کیے اور میاں طرح دار نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، پاجامے کے پائینچے اُوپر کر کے درخت پر چڑھنے لگے۔ لیکن دھان پان سے آدمی درخت پر چڑھنے کی سکت کہاں سے لاتے۔ ذرا سی دیر میں ہانپنے لگے۔ لڑکوں نے جو یہ حال دیکھا تو میاں صاحب کی مدد کو پہنچے اور اُنہیں کاندھے پر سوار کر کے درخت پر چڑھا ہی دیا۔

میاں طرح دار دھڑکتے ہوئے دِل اور کانپتی ہوئی ٹانگوں سے ابھی ذرا ہی اُوپر گئے ہوں گے کہ چوکی دار کے کتّے نے آہٹ پا کر بھونکنا شروع کر دیا۔ لڑکوں کے اوسان خطا ہو گئے اور میاں طرح دار کی تو یہ حالت ہوئی جیسے بدن میں جان ہی

نہیں رہی تھی۔ ایک لڑکے نے آہستہ سے کہا "طرح دار! جلدی نیچے اُتر آؤ۔۔۔ فوراً کُود پڑو۔ ہم تمہیں سنبھال لیں گے لیکن میاں صاحب میں تو ہلنے کی بھی سکت نہ رہی تھی۔ لڑکوں نے جو دیکھا کہ میاں طرح دار کے ہاتھوں سبھی پکڑے جائیں گے تو سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے۔ چوکی دار کے کتّے نے کُچھ دُور اُن کا پیچھا کیا اور پھر دُم ہلاتا ہوا واپس آ گیا۔

اُدھر میاں طرح دار درخت کی ٹہنی پر بیٹھے، خوف کے مارے اپنی موت کی دُعا مانگ رہے تھے۔ ان کا سارا بدن پسینے میں شرابور تھا اور ہاتھ پاؤں یوں کانپ رہے تھے جیسے آندھی میں درختوں کی ٹہنیاں ہلتی ہیں۔ کتّے کو چور کے بدن کی خوشبو مل گی تھی، وہ اُسی درخت کے نیچے جس پر میاں طرح دار کا آشیانہ تھا، کھڑا دُم ہلا ہلا کر بھونک رہا تھا۔ چوکی دار ایک ہاتھ میں لالٹین اور دوسرے میں لاٹھی لے کر آنکھیں جھپکتا ہُوا آیا اور اِدھر اُدھر دیکھ کر واپس چلا گیا۔

وہ رات میاں طرح دار نے درخت پر گزاری کُتّا کِتنی ہی بار بھونکتا ہُوا آیا اور واپس چلا گیا اور چوکیدار کتنی ہی دفعہ چور کی تلاش میں لاٹھی گھُماتا ہوا پاس سے

نِکل گیا۔ میاں طرح دار نے ایک دو بار کوشش کی کہ چوکی دار کو مدد کے لیے پُکاریں، لیکن مُنہ سے آواز ہی نہ نکلی۔

پچھلی رات کو چوکی دار پھر اِدھر سے گزرا تو اچانک چاندنی میں اُس کی نظر میاں طرح دار پر پڑ گئی۔ قریب تھا کہ میاں صاحب بے ہُوش ہو کر گِر پڑتے لیکن چوکی دار نے جب ڈپٹ کر کہا "نیچے اُترو" تو وُہ درخت کی ٹہنی سے کُچھ اور چمٹ گئے اور رو کر بولے: "مُجھے نیچے اُترنا نہیں آتا۔"

چوکی دار سمجھ گیا کہ چور قابو میں آ گیا ہے اور کہیں بھاگ کر نہیں جا سکتا۔ وُہ چُپ چاپ واپس ہُوا اور لمبی تان کر سو رہا، صُبح جب اُس نے میاں طرح دار کو کاندھا دے کر درخت سے نیچے اُتارا تو وُہ خُوف اور رتجگے کے سبب بُخار میں بھُن رہے تھے۔ وُہ کوئی بھلا آدمی تھا۔ میاں صاحب کو کاندھے پر لاد کر ہوسٹل میں ڈال گیا۔ آخر علاج معالجے کے بعد میاں صاحب کی طبیعت بحال ہُوئی اور دوستوں نے ان کی صحت کی خُوشی میں دعوت بھی اُڑائی لیکن میاں طرح دار نے اس واقعے کے بعد سے اپنی فرضی بہادُری کے سارے کارنامے بھُلا دِیے تھے۔

مُعمّا

رازؔ یُوسفی

"اے بیگم! سُنتی ہو۔" مرزا حامد بیگ الماری میں رکھّی ہوئی کتابوں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے بولے۔ "میں نے یہاں تازہ معمّے کے حل کی نقل رکھّی تھی۔"

"میں کیا جانوں۔ وہیں کہیں ہو گی۔" بیگم تنک کر بولیں۔ وُہ ابھی باورچی خانے میں گیلی لکڑیوں کے ساتھ سر کھپا رہی تھیں، جو پھُنکنی سے بار بار پھُونکیں مارنے

کے باوجود سُلگنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔

مرزا جی اس رُوکھے پھیکے جواب پر سہم کر رہ گئے اور بڑی تیزی کے ساتھ کاغذات کو اُلٹنے پلٹنے لگے۔ مگر معمّے کے حل کی نقل کو جیسے زمین نِگل گئی تھی یا آسمان کھا گیا تھا۔ سر توڑ کوشش کے باوجود مِلنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔

مرزا جی کسی زمانے میں اچھے کھاتے پیتے آدمی تھے اور سرکاری محکمے میں ہیڈ کلرک تھے۔ مگر وقت بگڑتے دیر نہیں لگتی۔ معمولی سی بات پر افسر سے اَن بَن ہو گئی اور انہیں اس بات پر اِتنا تاؤ آیا کہ ملازمت سے اِستعفا دے کر گھر آ کر بیٹھ رہے۔ مہنگائی کے زمانے میں ہاتھ سے ملازمت کا نِکل جانا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ چند ہی دنوں میں آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو گیا۔ بال بال قرض میں بندھ جانے کے باوجود مالی حالت کے سُدھرنے کی کوئی صُورت نہ رہی۔ ایک لڑکا کالج میں تعلیم پا رہا تھا۔ وہ بھی غربت کی وجہ سے تعلیم جاری نہ رکھ سکا۔

مرزا جی بڑے آرام پسند انسان تھے۔ ہر وقت گھر میں بیٹھے راتوں رات امیر بننے کے خواب دیکھتے رہتے اور اس مقصد کے لیے اپنی بچی کھُچی پونجی کو لاٹریوں اور

معمّوں پر ضائع کرتے رہتے تھے۔ ان کی بیگم کو ان کی یہ آرام پسندی ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ وُہ اُنہیں کام کاج کرنے پر اُکساتی رہتی تھیں مگر وُہ بھی اپنی ہٹ کے پکّے تھے اور اپنی من مانی کرتے تھے۔ اسی وجہ سے اکثر اُن کے گھر میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھگڑا ہو جاتا تھا۔

مرزا جی ابھی حل کی نقل تلاش ہی کر رہے تھے کہ دروازے پہ دستک ہوئی۔ وُہ لپک کر باہر نکلے۔ دروازے پر تار والا کھڑا تھا۔ اس نے ایک لفافہ اُن کے ہاتھ میں دے دیا اور سلام کر کے واپس چلا گیا۔ اُنہوں نے کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے لفافہ کھولا۔ اور مارے خُوشی کے اُن کی گھگّی بندھ گئی۔ اُنہوں نے صحیح معمّا حل کر کے ایک لاکھ روپے کا انعام جیت لیا تھا۔ اور اُنہیں تار کے ذریعے اُس کی خوشخبری دی گئی تھی۔

وہ بھاگے بھاگے اندر پہنچے اور جاتے ہی بیگم کو یہ خوشخبری سُنائی۔ پہلے تو بیگم کو یقین نہ آیا۔ لیکن جب اُنہوں نے تار کا مضمُون پڑھ کر سُنایا تو یقین کرتے ہی بن پڑی۔ گھر بھر میں خُوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ان کا اکلوتا لڑکا راشد یہ خبر سُن کر پھُولا نہ

سمایا۔ اوس پڑوس کے رہنے والے مبارک باد دینے لگے اور ہر طرف سے مٹھائی کا مطالبہ ہونے لگا۔ مرزا جی اس کامیابی پر بے حد مسرور تھے۔ ان کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا اور اُنہیں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اُن کے پَر لگ گئے ہوں اور وہ ہوا میں اُڑے جا رہے ہوں۔ ابھی وہ اِنہی خیالوں میں ڈوبے ہوئے تھے کہ دروازے پر ایک بھاری بھر کم آواز گونجی۔

"آمِد صائب۔"

"کون ہے بھائی؟" مرزا جی لپک کے باہر نکلے۔

"اسلامُ علیکم" سُود خُور پٹھان نے ایسی گرج دار آواز میں سلام کیا کہ مرزا جی اُچھل کر رہ گئے۔

"وعلیکُم السّلام۔" مرزا جی نے دھڑکتے ہوئے دِل سے سلام کا جواب دیا۔ اور اشارے سے مردانہ کمرے میں تشریف لے گئے۔

"تشریف رکھیے خان صاحب!" مرزا جی نے بڑی خوشامد سے کہا۔

”خوچہ! آمارے پاس رَکنے کے لیے کُچھ نئیں اے۔“ پٹھان بڑی بڑی آنکھیں نکال کر کھڑے کھڑے بولا۔

”میرا مطلب ہے بیٹھ جایئے۔“

”تو ایسا بولو نہ بابا۔“ پٹھان کُرسی پر بیٹھتے ہُوئے بولا۔

”فرمایئے آج کیسے تکلیف کی ہے آپ نے؟“ مرزا جی نے پُوچھا۔

”او تکلیپ او گا تمیں۔ اَم تو ٹِیک ٹاک اے۔“

”آپ غلط سمجھے خان صاحب! میں تو یہ پُوچھ رہا تھا کہ آج آپ کیسے آئے ہیں؟“

”او، اَم اپنی سَیکل پر آیا اے۔ اور کیسے آتا؟“

”نہیں خان صاحب! میرا پوچھنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ کِس کام سے آئے ہیں؟“

”اچّھا! یہ بات اے، تو سنو۔ اَم اپنا کرضہ وصُول کرنے آیا اے اور آج وصول کر کے ای جائے گا۔ کیونکہ تمہیں ایک لاکھ روپیہ ملا اے نا۔“

”خان صاحب! ابھی تو صرف تار ہی ملا ہے۔ روپیہ نہیں ملا۔ یہ تار دیکھ لیجے۔“
مرزا.جی نے پٹھان کی طرف تار بڑھاتے ہوئے کہا۔

”اوخوچہ! یہ کاغذ کی زبان اَم نہیں جانتا۔“

”خان صاحب! ایک ہفتے تک چیک بھُن جائے گا۔ پھر آپ کو پائی پائی ادا کر دوں گا۔ بے فکر رہیں۔“

”اچّھا، اَم آپ کی بات کا اتبار کرنا اے۔ ایک اَپتہ بعد اَم پِر آئے گا اور اپنا کرض لے کر ای جائے گا۔ آپ کی کوئی بات نہیں سُنے گا۔“

ٹھیک ہے خان صاحب“!

پٹھان ڈرا دھمکا کر چلا گیا اور مرزا.جی کی ساری خوشی ڈھیر ہو کر رہ گئی۔ وہ گہرے فکر میں ڈوبے ہوئے بوجھل قدموں کے ساتھ اندر پہنچے۔ بیگم نے مرزا.جی کا سُتا ہوا چہرہ دیکھ کر پُوچھا: ”خیر تو ہے، آپ نے فکر مند نظر آرہے ہیں؟“

”وہی کمبخت سود خور پٹھان آیا تھا۔ اچھے خاصے موڈ کا ستیاناس کر گیا۔ قرض بھی

کیسی بُری لعنت ہے۔ آج قرض نہ لیا ہوتا تو کیوں بُری بھلی باتیں سُننی پڑتیں۔"

"خیر لعنت بھیجئے۔ اب تو اللہ میاں نے ہمارے دن پھیر دیے ہیں۔ ایک لاکھ روپے کی رقم کُچھ کم نہیں ہوتی۔ تمام دِلِدّر دُور ہو جائیں گے۔ سب سے پہلے تو اس ملعون کا قرض ہی چُکانا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں سب سے پہلے اِسی لعنت سے چھٹکارا پاؤں گا۔ پھر سمن آباد میں ایک عالی شان بنگلہ بنواؤں گا۔"

"نہیں، سمن آباد میں نہیں، گلبرگ میں۔" بیگم نے لُقمہ دیا۔

"چلو گلبرگ میں ہی سہی۔ دو چار ہزار کا فرق بھی کوئی فرق ہوتا ہے اور ہاں! بنگلے کے ساتھ کار کا ہونا بھی نہایت ضروری ہے۔"

"اس میں کیا شک ہے! کار کے بغیر تو بنگلے کا تصوّر ہی ادھورا رہتا ہے اور کار بھی بیوک ہونی چاہیے۔" بیگم اترا کر بولیں۔

"مجھے تو شیورلیٹ پسند ہے۔"

”اپنی اپنی پسند ہے۔ شیور لیٹ ہی سہی۔ آپ کی پسند میری پسند ہو گی۔“

”کار اور بنگلے کے ساتھ ساتھ ملازموں کا ہونا بھی ضروری ہے۔“

”اس ضرورت سے کِس کافر کو اِنکار ہے۔

ساری زندگی باورچی خانے میں سر کھپایا ہے۔ میں نے تو آج سے سوچ لیا ہے کہ جب تک معمّے کی رقم نہیں آتی، کھانا ہوٹل ہی سے منگواؤں گی۔ بھلا ملازموں کے بغیر بھی زندگی میں کوئی لطف آتا ہے؟“

”بیگم! اب تو تُمھیں یقین آ گیا ہو گا کہ اللہ میاں نے ہمیں کیا اعلیٰ درجے کا دماغ دیا ہے۔ یہ معمّے بنانے والا بھی ارسطو بنا پھرتا تھا۔ مگر کم بخت کو ایسی اُلٹی پٹخنی دی ہے کہ عمر بھر یاد رکھے گا۔ ہی ہی ہی۔“

”کیا کہنے ہیں آپ کے دماغ کے۔ خُدا بُری نظر سے محفوظ رکھے۔ اس مرتبہ تو آپ نے کمال ہی کر دکھایا۔ ٹھہریے میں آپ کے ماتھے پر توّے کی ذرا سی کالک لگا دوں۔ بڑی بوڑھیوں کا کہنا ہے کہ اس ٹوٹکے سے بُری نظر نہیں لگتی۔“

بیگم نے اُٹھ کر توّے سے ذرا سی کالک اُنگلی میں لگائی اور اُسے مرزا جی کی پیشانی سے چھُوا دیا۔

"اجی ہٹو بھی! مَیں ایسی باتوں کا قائل نہیں۔"

"آپ ہوں یا نہ ہوں، میں تو ہوں۔"

"اچھّا خیر! تُمہاری مرضی۔"

"ہاں! خوب یاد آیا، اب ہمیں راشد کی شادی بھی کر ہی دینی چاہیے۔ ماشاء اللہ نجمہ جوان ہے۔"

"نجمہ! کون نجمہ۔۔۔؟" مرزا جی دِماغ پر زور دے کر بولے۔

"ارے! آپ نجمہ کو بھُول گئے۔ میرے بھائی جان کی اکلوتی بچّی۔ چیندے آفتاب، چندے ماہتاب۔ آپ نے تو بہت دنوں سے اُسے دیکھا ہی نہیں۔ میں پچھلے سال جب بھائی جان کے ہاں گئی تو اُسے دیکھ کر بھونچکا سی رہ گئی۔ کیا بُوٹا سا قد نِکالا ہے میری بھتیجی نے۔ لاکھوں میں ایک ہے۔ گھر میں دُلہن بن کر آئے گی

تو بجلی کی روشنی کی ضرورت نہ رہے گی اور پھر بچپن ہی سے راشد سے اُس کی منگنی بھی تو ہو چکی ہے۔"

"کیا واہی تباہی بک رہی ہو۔ بیگم!" مرزا جی جھُنجھلا کر بولے۔ "اب راشد کی نجمہ سے شادی نہیں ہو سکے گی۔"

"کیوں نہیں ہو سکے گی۔ کیا کیڑے پڑ گئے ہیں میری بھتیجی میں۔ قبول صورت ہے۔ لِکھّی پڑھی ہے۔"

"اوہو! لِکھنا پڑھنا ہی تو سب کُچھ نہیں ہوتا۔ راشد اب لکھ پتی باپ کا بیٹا ہے اور نجمہ ۔۔۔؟ اب کیا کہوں میں ۔۔۔۔"

"آپ یہی کہنا چاہتے ہیں نا کہ میرے بھائی جان غریب ہیں تو پھر کیا ہُوا۔ یہ تو اللہ کی دین ہے۔ کل تک ہم بھی تو غریب تھے اور پھر امیری غریبی کے فرق سے دِل تو نہیں بدل جاتے۔ رشتے تو نہیں ٹوٹ جاتے۔"

"ٹوٹ جاتے ہیں۔ اب راشد کی شادی کِسی امیر گھرانے میں ہی ہو گی تا کہ جہیز

میں ڈھیر ساماں ملے۔ امیر گھرانوں کے بچّوں کے بیاہ امیر گھرانوں ہی میں اچھّے لگتے ہیں؟"

"تو آپ ایک ہی دِن میں بدل گئے۔ مگر میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ راشد کا بیاہ نجمہ کے ساتھ ہی ہو گا۔"

"نہیں ہو گا۔ ہر گز نہیں ہو گا۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ اس گھر میں جو کُچھ میں چاہوں گا، وہی ہو گا۔"

"میرے جیتے جی ایسا نہ ہو گا۔ مَیں جان دے دوں گی۔"

"تمہاری کِسے پرواہ ہے۔ تُمہارے مرنے کے بعد دوسری شادی رچاؤں گا۔ چند سفید بال اُگ آئے ہیں تو کیا ہوا؟ لکھ پتی آدمی ہر عمر میں شادی رچا سکتا ہے۔"

"او خُدا! یہ دولت کِتنی بڑی مُصیبت ہے۔ ابھی دولت کا سایہ بھی نہیں دیکھا کہ گھر خاک ہونے لگا۔ کیا تمام دولت مندوں کے دِل اِسی طرح پتھّر کے بن جاتے ہیں؟"

”کیوں نہ بن جائیں، دولت کا نشہ بُہت تیز ہوتا ہے اور اب تو میں بھی دولت مند ہوں۔ لکھ پتی ہوں۔۔۔ ہاہا۔۔۔ ہاہا۔“

ابھی مرزا جی کے قہقہے فضا میں گونج ہی رہے تھے کہ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ مرزا جی ”کون ہے بھائی؟“ کہتے ہوئے باہر کی طرف لپکے۔ وہی تار والا ایک مرتبہ پھر دروازے پر کھڑا اُن کا اِنتظار کر رہا تھا۔ مرزا جی نے جلدی جلدی تار لیا اور لفافہ کھولتے ہوئے اندر پہنچے۔ ابھی تار کا پورا مضمون بھی نہ پڑھ پائے تھے کہ کاغذ اُن کے ہاتھ سے چھُوٹ گیا اور وہ لڑکھڑاتے ہوئے چارپائی پر گر پڑے۔ تار میں لکھّا تھا:

”ہم بڑے افسوس کے ساتھ آپ کو یہ اِطّلاع دیتے ہیں کہ معمّے کا صحیح حل لائل پور کے حامد صاحب کا تھا۔ مگر دفتر کی غلطی سے پہلے انعام کا تار آپ کو دے دیا گیا جس کے لیے ہم مُعافی چاہتے ہیں۔“

اُلٹا نگر

جبّار توقیر

ایک تھا اُلٹا نگر۔ کہتے ہیں کہ یہاں کے رہنے والوں کی ہر بات اُلٹی تھی۔ وُہ بائیں ہاتھ سے کھانا کھاتے، بائیں طرف چلتے اور ہمیشہ بائیں کروٹ سوتے تھے۔ وہ لیٹ کر کھانا کھاتے اور بیٹھ کر سوتے تھے۔ لحاف بچھاتے اور گدّے اوڑھتے تھے۔ مُنہ

پہلے دھوتے اور ہاتھ بعد میں، روٹی پہلے کھاتے اور سالن بعد میں۔

درزی اُلٹے کپڑے سیتے تھے۔ ہر شخص جُوتے خریدنا ضروری سمجھتا تھا مگر جب چلتا تو جُوتوں کو سر پر رکھ لیتا۔ حکیم زکام کے مریض کو قبض کی دَوا دیتے اور قبض کے مریض کو ایسی دَوا دیتے کہ اُسے زکام ہو جاتا۔ اگر اُنھیں کہیں جلدی جانا ہوتا تو بہت آہستہ چلتے اور جہاں جلدی نہ پہنچنا ہوتا وہاں اِتنی تیزی سے جاتے جیسے کہیں آگ لگی ہو۔ کسی کا بیاہ ہوتا تو سب مل کر اِس طرح روتے کہ دِل سہم جاتا اور جب کوئی مر جاتا تو اِتنا ہنستے اِتنا ہنستے کہ پیٹ میں بل پڑ جاتے۔ بچّے سارا دِن گلیوں میں آوارہ پھرتے رہتے اور بوڑھے پڑھنے کے لیے بلا ناغہ سکول جاتے تھے۔

غرض کہ اس شہر کا باوا آدم ہی نرالا تھا۔ لیکن اپنی اُلٹی پُلٹی باتوں کے باوجود بھی اُلٹے نگر کے لوگ بڑے سُکھ چین سے رہتے تھے۔ ان کے ہاں کبھی کوئی جھگڑا نہ ہوا تھا۔ کوتوالی کے سپاہی سارا دِن لمبی تان کر سوئے رہتے۔

اُلٹے نگر میں کوئی اجنبی آتا تو ہر شخص اسے اپنے ہاں ٹھہرانے کی کوشش کرتا۔

اگر وُہ شخص کسی کے ہاں مہمان ٹھہرنا پسند نہ کرتا تو وُہ اُسے غلط راستا بتادیتے اور وُہ اجنبی سارے شہر میں پاگلوں کی طرح گھومتا پھرتا۔

اس شہر کی اُلٹی پُلٹی باتوں کی خبر بادشاہ کے کانوں تک پہنچیں تو اُسے بڑا غصّہ آیا۔ اس نے اپنے ایک وزیر کو حکم دیا کہ فوراً اُلٹا نگر جاؤ اور وہاں کے لوگوں کو سیدھا کرنے کی کوشش کرو۔ وزیر دوسرے ہی دِن اُلٹا نگر جا پہنچا۔

"خُدا ہی بہتر جانے یہ کِس قسم کا شہر ہے۔ مُجھے تو اِن لوگوں سے خوف آتا ہے۔" وزیر نے اسٹیشن سے باہر نِکل کر چاروں طرف نگاہ دوڑا کر کہا۔

ایک سڑک پر بورڈ لگا تھا۔ "یہ سڑک جنوب کی طرف جاتی ہے۔"

وزیر بولا۔ "لا حول ولا قوۃ! ارے یہ حماقت تو دیکھو ذرا۔ صاف ظاہر ہے کہ اس طرف مغرب ہے۔ مگر اِن احمقوں نے اُلٹا بورڈ لگا رکھا ہے۔"

"جناب! یہ اُلٹا نگریوں ہی تو مشہور نہیں ہو گیا۔" ایک افسر نے کہا۔

وُہ آگے بڑھے تو ایک آدمی ملا۔ وزیر نے اُس سے کہا۔ "بھئی! ہمیں کوتوالی جانا

ہے۔ کون سارا ستا جاتا ہے اُدھر؟"

"کوتوالی جانے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ میرے گھر مہمان کیوں نہیں رہ جاتے؟" اُس نے جواب دیا۔

اِتنے میں اور بھی بہت سے لوگ اکٹھّے ہو گئے اور ہر شخص اصرار کر رہا تھا کہ وُہ اس کے ہاں ٹھہریں مگر جب وہ نہیں مانے تو انہوں نے کہا۔ "اچھا! آپ کی مرضی! ایسا کیجیے کہ ناک کی سیدھ میں چلے جایئے۔ تھوڑے ہی فاصلے پر کوتوالی ہے۔"

وُہ ان کا شکریہ ادا کر کے اُن کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے لگے۔ جب وُہ سڑک کے آخر میں پُہنچے تو اُنہیں بھنگیوں کے گھر نظر آئے۔

"لاحول ولا قوّۃ! بھئی یہ لوگ تو اوّل درجے کے شیطان ہیں۔ لو ہمیں بھنگیوں کے گھر بھیج دیا ہے۔ حد ہو گئی۔" وزیر نے غصّے سے کہا۔

وُہ لوگ سارا دِن شہر میں مارے مارے پھرے اور کہیں شام کے وقت بڑی

مُشکلوں سے کوتوالی پہنچے۔ یہ لوگ کئی دِن تک وہاں بیٹھے سر پٹختے رہے مگر اُلٹے نگر کے لوگوں نے اُن کی ایک نہ سُنی۔ ان کی ہر بات کا اُنھوں نے مذاق اُڑایا۔ اُن کے بنائے ہوئے کِسی قانون کو اُنھوں نے نہیں مانا۔ ان کی تدبیریں سب اکارت گئیں۔

"ہم کِس پاگل خانے میں آ گئے ہیں۔ اِن لوگوں کو تو گولی مار دینی چاہیے۔ ان کی کوئی بھی تو کل سیدھی نہیں ہے۔" ایک افسر نے تنگ آ کر کہا۔

"چند دن اور کوشش کرتے ہیں۔ شاید یہ لوگ سیدھی راہ پر آ جائیں۔" وزیر بولا۔

ایک دن دو ڈاکو سرکاری خزانہ لوٹ کر اُلٹا نگر چلے آئے۔ اُن کا خیال تھا کہ اس شہر کے لوگ بے وقوف ہیں اِس لیے وہ یہاں آرام سے بیٹھ کر مَوج اڑائیں گے۔ جونہی یہ شامت کے مارے اُلٹے نگر میں داخل ہوئے، لوگوں نے اُنہیں گھیر لیا اور ہر شخص اُنہیں اپنے ہاں مہمان ٹھہرانے کے لیے اِصرار کرنے لگا۔

"اجی صاحب! آپ میرے غریب خانے پر چلیے۔" ایک شخص نے کہا۔ چُپ رہو

تم اتنے بڑے آدمیوں کی میزبانی کے اہل نہیں ہو۔ حضُور! آپ بندے کے گھر چلیے۔ وہاں آپ کو ہر طرح کا آرام ملے گا۔" دوسرے نے کہا۔

"تم کیا کرایہ لوگے؟" ایک ڈاکو نے پوچھا۔

"آپ ہماری توہین کر رہے ہیں صاحب۔ ہم مہمانوں سے کرایہ نہیں لیا کرتے۔" اس آدمی نے کہا۔

"پھر تو بہت اچھّی بات ہے۔ ہم تُمہارے ہی گھر چلیں گے۔" ڈاکوؤں نے کہا۔

"نہیں نہیں۔ میں اتنی دُور سے آپ کے پیچھے آیا ہوں۔ آپ کو میرے گھر چلنا ہو گا۔" ایک اور آدمی نے کہا۔

"بکواس بند کرو۔ یہ میرے مہمان ہیں۔ میں ان کے لیے درجنوں مُرغے ذبح کروا سکتا ہوں۔" ایک دوسرے آدمی نے کہا اور دونوں ڈاکوؤں کو پکڑ کر اپنے گھر کی طرف گھسیٹنے لگا۔

جب دُوسروں نے دیکھا کہ یہ تو اُنہیں ہانک لے چلا ہے تو اُنھوں نے دوسروں کو

بازوؤں اور ٹانگوں سے پکڑ کر اپنے اپنے گھر کی طرف گھسیٹنا شروع کر دیا۔ اس کھینچا تانی میں ڈاکوؤں کے کپڑے تار تار ہو گئے۔

اِتّفاق سے کوتوال کا اُس طرف سے گزر ہوا۔ اس نے مجمع لگا دیکھا تو آگے آیا اور بڑی مُشکل سے ڈاکوؤں کو لوگوں کے پنجے سے چھڑایا۔

"کیا بات ہے۔ تُم اِنہیں کیوں مار رہے ہو؟" کوتوال نے پُوچھا۔

"مار کون رہا ہے جناب! ہم تو اِنہیں اپنے ہاں مہمان ٹھہرانا چاہتے ہیں۔" لوگوں نے کہا۔

"اوہو! تو یہ جھگڑا ہے۔ اس کا حل صرف یہ ہے کہ اِن دونوں کو میں اپنے ہاں مہمان رکھوں گا۔ تم سب اپنی اپنی راہ لگو۔" کوتوال نے بڑے رُعب سے اُنہیں حُکم دیا اور خود اُن دونوں کو اپنے گھر لے آیا۔

لوگوں سے جب کُچھ اور نہ بن پڑا تو اُنہوں نے ڈاکوؤں کی موٹر کو خوب صاف کیا اور اُس کا پٹرول نکال کر اُس میں دُودھ بھر دیا۔

دوسرے دِن صُبح کو ریڈیو پر سرکاری خزانہ لوٹے جانے کی خبر سُنائی گئی اور ڈاکوؤں کا حُلیہ بھی بتایا گیا۔ اُلٹے نگر کے لوگوں نے چوروں کے حُلیے پر غور کیا تو اُنہیں یقین ہو گیا کہ کوتوال کے مہمان ہی وُہ ڈاکو ہیں۔ وُہ غصّے سے لال پیلے ہو کر کوتوال کے گھر کی طرف چلے۔

"میرے دروازے کے سامنے کیوں بھیڑ لگا رکھی ہے تم نے؟" کوتوال نے دروازہ کھول کر پُوچھا۔

"جناب! آپ کے دونوں مہمان ڈاکو ہیں۔ سرکاری خزانہ لُوٹ کر یہاں لائے ہیں۔" لوگوں نے کہا۔

"ایں! واقعی؟" کوتوال نے حیران ہو کر کہا اور چوروں کو پکڑنے کے لیے اندر بھاگا مگر چور پہلے ہی پچھلے دروازے سے رفو چکر ہو چُکے تھے۔

"پکڑو پکڑو۔ جانے نہ پائیں۔ ابھی یہیں کہیں ہوں گے۔" کوتوال نے کہا۔

لوگ بھاگتے ہوئے چوک میں پہنچے۔ یہاں ڈاکوؤں کی کار کھڑی تھی اور وُہ کار میں

بیٹھے انجن سٹارٹ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر کار میں پڑول کی جگہ دُودھ بھرا ہوا تھا۔ وُہ چلتی کیسے۔ ڈاکو لوگوں کو اپنی طرف آتا دیکھ کر موٹر چھوڑ چھاڑ سر پٹ بھاگے مگر چند ہی منٹوں میں گرفتار کر لیے گئے۔

جب لوگ ڈاکوؤں کو لے کر کوتوالی پُہنچے تو وزیر اپنے بنائے ہوئے قانون کوتوال کو سمجھا رہا تھا۔

"جناب! ہمیں آپ کے قانون کی کوئی ضرُورت نہیں۔ ہم اپنے چوروں کو خود پکڑ سکتے ہیں۔" ایک شخص نے کہا۔

"بھئی! تُم اپنی اُلٹی پُلٹی حرکتوں سے اپنا کام نکال ہی لیتے ہو۔" وزیر نے ہنس کر کہا۔

"میرا خیال ہے کہ اُنہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔" ایک افسر بولا۔ "یہ جانیں اور ان کا کام۔ اگر ہم کُچھ دن اور یہاں رہے تو ہم بھی ان کی طرح اُلٹے پُلٹے ہو جائیں گے۔" اور وہ سب اُسی دِن اُلٹے نگر سے چلے گئے۔

نئے پُرانے

شرون کمار

سُرمئی شام خاموشی سے محلّے میں اُتر آئی تھی۔ گیانو ابھی تک چھجّے پر جھُکی ہوئی سامنے والی خستہ حال حویلی کو دیکھ رہی تھی۔ یہ حویلی ایک مدّت سے ویران پڑی

تھی اور اس کا چھجّا تقریباً لٹک سا گیا تھا۔ جیسے اب گِرا کہ اب گِرا۔ کبھی کبھی رات کو اس حویلی کا کوئی مخدوش حصّہ، چھت کی چند اینٹیں یا کسی دیوار کا کُچھ حصّہ بڑی بھیانک آواز سے گر جاتا اور بستر پر پڑی گیانو کا دِل دھک سے رہ جاتا۔ اسے ہر وقت اُس حویلی سے ڈر آتا تھا۔ وُہ روز صُبح اپنے چھجّے پر آتی اور دیر تک کھڑی حویلی کو دیکھتی رہتی۔ ہر رات وُہ دُعا کرتی کہ ساری کی ساری حویلی اِک دَم گِر جائے۔ رات کے سنّاٹے میں جب بھی حویلی کے اندر کہیں ملبہ گِرنے کی ڈراؤنی آواز گونجتی تو اُسے لگتا جیسے بھُوت اُچھل کُود رہے ہیں۔ پھر کبوتروں کے بچّے اچانک چیں چیں شروع کر دیتے۔ پھر بلّیاں لڑنا شروع کر دیتیں۔ رات کا سنّاٹا اور بھی ڈراؤنا ہو جاتا اور گیانو ساتھ سوئے ہوئے ننّھے کو زور سے چمٹا لیتی۔

آج شام سے ہی حویلی میں ملبہ گرنے اور کبوتروں کے بچّوں کے چیں چیں کرنے کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ شیام ابھی گھر نہیں پہنچا تھا۔ رمن اور پپّو اسکول سے آ کر بستہ پھینک، روٹی کھا، گلی میں کھیلنے چلے گئے تھے۔ گھر میں وُہ اور ننّھا اکیلے تھے اور گیانو کو حویلی دیکھ دیکھ کر خوف آ رہا تھا۔

دھڑام! دھڑام!

حویلی کا کُچھ حصّہ گِرا۔ گرد کے بادل اُٹھے۔ پُرانے ملبے کی بُو دَم گھونٹنے لگی۔ بُہت سے کبوتر پھڑپھڑا کر اُڑے اور چھت کے سوراخ سے آپس میں ٹکراتے ٹکراتے، باہر آ گئے۔ گیانو کانپتی ہوئی پیچھے ہٹ گئی اور کھڑکی بند کر دی۔ تھوڑی دیر بعد شیام آ گیا۔ اُس نے کھڑکی کھول دی۔ گرد بیٹھ چکی تھی۔ آسمان پر پچھّم کی طرف سے کالی بدلی بڑھی آ رہی تھی اور ہوا میں ٹھنڈک اور نمی بڑھ گئی تھی۔ ننّھا سو گیا تھا۔ گیانو اُسے بستر پر لٹا کر شیام کے قریب آ کھڑی ہو گئی۔

"یہ کمیٹی والے اس حویلی کو گِرا کیوں نہیں دیتے؟"

"اس کے مالک مِل ملا کر رُکوا لیتے ہیں۔ حکم تو ہے کہ ایسی عمارتوں کو گِرا دیا جائے۔" شیام نے جواب دیا۔

"مُجھے تو بڑا ڈر لگتا ہے۔ پھر بچّے گلی میں کھیلتے رہتے ہیں۔"

شیام نے حویلی کی طرف دیکھا اور خاموش رہا۔۔۔ سیٹھی مٹھّن لال کے ڈرائنگ روم میں آج شیام کی بے عزّتی ہوئی تھی۔ اِس لیے وہ اندر ہی اندر تِلملا رہا تھا۔

اُس کے دل میں جیسے اُبال آ رہا تھا۔ اور وُہ چاہتا تھا کہ سیٹھ مٹھّن لال کو اس عمارت میں زندہ جلادے۔ اس وقت وُہ گیانو سے اپنی بے عزّتی کا ذکر کر کے اُسے دُکھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جب کبھی ایسی کوئی بات ہوتی، وہ اکیلا ہی سہہ جاتا۔ اُسے معلُوم تھا کہ اُس کے غم سے گیانو غمگین ہو جاتی ہے۔ماں کے ساتھ بچّے بھی اُداس ہو جاتے ہیں۔ معصوم بچّوں کے کملائے ہوئے چہرے دیکھ کر شیام کو رونا آ جاتا۔

"آج سیٹھانی نے مُجھے بُلایا تھا۔" گیانو بولی۔

"کیوں۔۔۔" ایک دم شیام نے پُوچھا۔

"رمن نے رنجن کو مارا تھا۔۔۔"

"پھر۔۔۔۔؟"

"میں ہاتھ جوڑ آئی۔۔۔۔"گیانو نے کہا۔ "مُجھے تو ان کی کوٹھی میں داخل ہوتے ڈر لگتا تھا۔ دو موٹے موٹے کتّے ہر وقت دروازے پر بیٹھے رہتے ہیں۔ ابھی

پرسوں اس نے لیلا کے لڑکے کو مارا تھا۔ بے چاری بیوہ۔۔۔ آگے پیچھے کوئی بولنے والا بھی نہیں۔۔۔ چُپ ہی رہ گئی۔"

"کوئی ہو بھی تو کیا کرے گا۔۔۔!" شیام بولا: "اِن امیر آدمیوں نے تو ہم غریبوں کا جینا حرام کر دیا ہے، بھگوان اُنہیں موت بھی نہیں دیتا۔۔۔" شیام کے دِل میں گھُلتا ہُوا زہر اُس کے لفظوں میں آگیا۔

"سیٹھ جی تُمہیں بھی بُلا رہے تھے۔۔۔!" گیانو بولی۔

"مُجھے کیوں۔۔۔؟"

"شکایت ہی کرنی ہو گی۔"

شیام کے ذہن میں موٹی بھینس کی کھال والے سیٹھ کی صُورت گھوم گئی۔ سیٹھ کپڑے کی مِل کا مالک تھا۔ شیام کا باپ اُن کے ہاں نوکر رہ چکا تھا۔ شیام نے وہاں نوکری نہیں کی تھی۔ خُود اُس کا باپ بھی نہیں چاہتا تھا کہ وُہ پرائیویٹ نوکری کرے۔ لیکن کمیٹی میں نوکری کر کے بھی شیام ایک طرح سے سیٹھ کا ہی نوکر

رہا۔ سیٹھ پچھلے چھ سال سے وہاں کا صدر تھا اور سیاہ و سفید کا مالک۔ اُسے اپنا بچپن بھی یاد تھا۔ جب وُہ کبھی کبھی اپنے باپ کے ساتھ سیٹھ کے ہاں جایا کرتا۔ اُسے تب ہی سے سیٹھ سے ڈر آنے لگا تھا۔ وُہ اپنے نوکروں سے کُچھ اس طرح بات کرتا جیسے وہ آدمی نہ ہوں، جانور ہوں۔ اُس کے باپ کی کئی مرتبہ بے عزّتی ہوئی تھی اور وُہ سر لٹکا کر چُپ چاپ سب برداشت کر لیتا تھا۔ تب شیام کو اپنے آپ پر بھی غصّہ آیا کرتا تھا۔ وہ سوچتا یہ آدمی میری ماں کو مارتا ہے، ڈانٹتا ہے، ہم بچّوں پر سختی کرتا ہے، گالیاں دیتا ہے، اس سیٹھ پر ہاتھ کیوں نہیں اُٹھاتا۔

دھیرے دھرے وُہ بھی اپنے باپ کی طرح خاموشی سے برداشت کر لینے کا عادی ہو گیا اور اسے اپنے باپ پر بے حد پیار آیا۔ شیام اُس رات باپ کی تصویر سے لپٹ کر خوب رویا تھا اور اپنے سوئے ہوئے بچّے کو بار بار چُوما تھا۔

ٹھنڈی ہوا کا جھُونکا آیا اور اُس کے بال بکھر گئے۔ گلی کے نُکّڑ پر لٹکتا برقی قمقمہ اپنی ایک زرد آنکھ سے چاروں طرف گھُور رہا تھا اور گلی میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ وُہ کھڑکی بند کر کے اندر آ گیا۔

"رمن اور پپوّ کہاں ہیں؟" اس نے کمرے میں خاموشی دیکھ کر کہا۔

"وہیں ہوں گے پنڈتوں کے طویلے میں۔ بُوا جَ وَتی سے کہانیاں سُن رہے ہوں گے۔" کیانو بولی۔

"بارش ہونے والی ہے۔" شیام نے یوں ہی کہا۔

"جا کر اُن دونوں کو لے آؤ، سردی بڑھ گئی ہے۔۔۔ میں توا رکھ کر روٹی تیّار کرتی ہوں۔"

شیام سیڑھیاں اُتر گیا۔

(2)

طویلے کا دروازہ ذرا سا کھُلا تھا۔ اندر مٹّی کے تیل کی کپّی کی مدّھم سی روشنی ایک کونے کو اندھیرے سے الگ کر رہی تھی۔ بُوا جَ وَتی کی تھکی تھکی، کمزور سی آواز سنائی دے رہی تھی۔ شیام ٹاٹ کا پردا اُٹھا کر اندر چلا گیا۔ بُوا اپنی مَیلی پھٹی ہوئی رضائی اُوڑھے چارپائی پر بیٹھی کہانی سُنا رہی تھی۔ دائیں طرف دیوار کے

طاقچے میں کپّی جل رہی تھی، برسوں سے دھوئیں نے جم جم کر طاق کے اُوپر سفید دیوار کا کُچھ حصّہ سیاہ کر دیا تھا، جیسے ننّھا سا سرو کھڑا ہو۔ شعلہ جیسے انہماک سے کہانی سُن رہا تھا۔ طویلے میں بچّے بُوا کے سامنے خاموش بُت بنے بیٹھے تھے۔ شیام کو لگا جیسے وُہ کسی پُراسرار کہانی کو اسٹیج پر دیکھ رہا ہو۔ پوپلے مُنہ، جھُریوں والے چہرے اور سفید بالوں والی بُوا جے وَتی، خود کسی پریوں کی کہانی کا معصوم سا کردار نظر آرہی تھی۔ شیام نے اس ماحول کو اپنی دخل اندازی سے خراب کرنا مناسب نہیں سمجھا اور چُپ چاپ کھڑا کہانی سُننے لگا۔

بُوا پپّو کو گود میں بٹھائے کہانی سُنا رہی تھی:

"شہزادہ بُہت بہادُر تھا۔ وُہ ہمیشہ سچ بولتا تھا اور کسی سے نہیں ڈرتا تھا۔۔۔"

"بُوا! بھوتوں سے بھی نہیں۔۔۔۔؟" رمن نے پُوچھا۔

"نہیں، وہ رات کو اپنے سفید گھوڑے پر سوار ہو کر جنگل میں چلا جاتا۔۔۔ وہاں ایک خُوب صُورت سی جھیل تھی۔ اُس میں کنول کے نیلے، سفید اور گُلابی پھُول کھِلتے تھے۔ وہاں پریاں راج ہنسوں پر بیٹھ کر سیر کرنے آتی تھیں اور گانے گاتی

تھیں۔

اُن کی شہزادی بھی بہُت خُوب صُورت تھی۔ شہزادے کو شہزادی سے پیار ہو گیا۔ وُہ بھی اُسے پیار کرنے لگی۔ وہاں ایک بُوڑھے پیپل پر ایک دیو رہتا تھا۔ وُہ شہزادی سے بیاہ کرنا چاہتا تھا۔۔۔۔ ایک رات وُہ شہزادی کو اُٹھالے گیا۔۔۔"

"پھر!" بچّوں نے ایک ساتھ پوچھا۔

"شہزادے نے اُس کی چیخ سُنی۔۔۔۔"

"بُوا جھوٹ بولتی ہے۔۔۔" سیٹھ ہر دیال کے لڑکے رنجن نے کہا۔

"چُپ۔۔۔!" رمن نے ڈانٹا۔ "کہانی سُننے دے۔"

"شہزادہ دیو سے لڑنے چل پڑا۔ بڑی سخت لڑائی ہوئی، شہزادے نے دیو کو مار دیا اور شہزادی سے بیاہ کر لیا۔"

"دیو کو کوئی نہیں مار سکتا۔" رنجن پھر بولا۔ بُوا مُسکرائی اور بُولی:

"بیٹے! جو بہادر ہوتے ہیں، وُہ ہمیشہ جِیت کر آتے ہیں۔۔۔"

بُوا! مَیں مار سکتا ہوں دیو کو۔۔۔" پپّو بولا۔ "میں بہادُر ہُوں۔" "ہاں! تُو بڑا بہادُر ہے۔۔۔"

"کوئی نہیں مار سکتا۔" رنجن بولا۔ "میرے ڈیڈی کہتے ہیں۔۔۔"

"میں مار سکتا ہوں دیو کو۔" رمن اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"بُوا جھُوٹ بولتی ہے۔" رنجن بھی کھڑا ہو گیا۔

"خبر دار! جو بُوا کو جھُوٹی کہا۔۔۔"!

"کہوں گا۔۔۔ کہوں گا۔۔۔" رنجن نے اکڑ کر کہا۔

رمن نے آگے بڑھ کر رنجن کی چھاتی پر گھُوسنا دے مارا۔ "اب کہہ۔۔۔"

رنجن فرش پر ِگر گیا۔ لڑکے ہنسنے لگے۔ اُس نے روتے ہوئے کہا۔ "ہمارا نوکر تُجھے مارے گا۔"

"میں اُس کا سر توڑ دوں گا۔۔۔!" رمن بولا۔

شیام نے آگے بڑھ کر رمن کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"لڑتا ہے، بے ایمان! چل گھر۔۔۔"!

"شیام! بچّے کو مارنا نہیں۔" بُوا جے وَتی نے کہا۔ "اس کا دِل ٹوٹ جائے گا۔۔۔
بچّوں کو پیار سے سمجھانا چاہیے۔ جاؤ رمن! لڑتے نہیں۔"

"یہ تُمہیں جھُوٹی کہتا ہے۔ کل اِس نے مُجھے ماں کی گالی دی۔ بڑا سیٹھ کا لڑکا بنا
پھرتا ہے۔" رمن نے کہا۔

"اچھّا، چل گھر۔۔۔"!

شیام دونوں بچّوں کو گھر لے آیا۔

شیام نے گھر آکر بیوی کو بتایا۔

"یہ تیرا رمن پھر لڑ آیا ہے، سیٹھ کے لڑکے سے۔"

"کیوں رے۔۔۔؟"

"ماں! وُہ تُمھیں گالی دیتا ہے، بُوا کو جھُوٹا کہتا ہے۔" رمن نے بوری پر بیٹھے ہوئے کہا۔

"ہاں، ماں اور گندی گندی گالیاں دیتا ہے۔ میں بھی اُسے ماروں گا۔ اور ہاں! میں بہادُر شہزادہ بنوں گا۔ پھر پری سے بیاہ کروں گا۔"

وُہ ماں کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ گیانو مُسکرا دی۔

"رمن لڑتے نہیں۔۔۔!" شیام نے سمجھایا۔ "اُس کا نوکر گنیشا مارے گا۔ اُس روز اُس نے کریم کو مارا تھا۔"

"ہاں! مارے گا۔۔۔! میں نہیں ڈرتا۔ گلی کے سارے لڑکے ہمارے ساتھ ہیں۔"

شیام سوچنے لگا کہ یہ بچّے کتنے نڈر ہیں اور وُہ خُود کتنا ڈرپوک ہے۔۔۔! کِسی دِن غریبی اُنہیں بھی کمزور اور ڈرپوک بنادے گی۔۔۔۔ وُہ اُداس ہو گیا۔

باہر بارش شروع ہو چکی تھی۔

(3)

رات بھر حویلی دھڑام دھڑام گرتی رہی تھی۔ آج آسمان صاف تھا۔ جنوری کے شفاف، نیلے کانچ کے نکھرے نکھرے آسمان کے پوربی کنارے سُنہری ہو چلے تھے۔ جیسے کِسی نے وہاں گوٹ ٹانگ دی ہو۔ گیانو نے چھجّے پر آ کر حویلی کی طرف دیکھا۔ وُہ تقریباً ساری گر گئی تھی۔ بس دیواریں کھڑی رہ گئی تھیں۔ مٹّی اور نانک شاہی اینٹوں کا ڈھیر کافی اُونچا ہو گیا تھا۔ لٹکتا ہُوا چھجّا گلی میں پڑا تھا۔ حویلی کے اندر اور کُچھ نہیں تھا۔ گیانو نے جیسے سُکھ کا سانس لیا۔ اُسے اب پچھلے مکان بھی نظر آ رہے تھے۔ اور وُہ مکان تو اب جیسے سامنے آ گیا تھا جس میں اُس کی سہیلی رہتی تھی۔ اب وُہ اس کی کھڑکی دیکھ سکتی تھی۔ اس شکستہ حویلی نے اُس کی سہیلی کے مکان کو چھپا رکھا تھا۔

بچّے بھی بہت خُوش تھے اور ملبے پر گھُومتے پھر رہے تھے۔ رمن سب سے آگے تھا۔ عورتیں ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھیں۔ آدمی بھی اُس حویلی کا ذکر کر رہے تھے۔

رنجن گنشے کے ہمراہ آیا۔

"وُہ ہے رمن!" اُس نے گنیشے کو بتایا۔

"کاکا جی کو کیوں مارا تھا بے!" گنیشے نے رمن کے سامنے جا کر پُوچھا۔

"اُس نے گالی کیوں دی تھی۔۔۔"!

"پھر مارا تو۔۔۔!" گنیشے نے ڈانٹا۔

"گلی کے تمام آدمی ایک دم وہاں پہنچ گئے۔

"کیوں تنگ کر رہا ہے بچّوں کو۔۔۔!" دُودھ والا آگے بڑھ کر بولا۔

"یہ کاکا جی کو مارتا ہے۔۔۔"!

"سنبھال کے رکھ اپنے کاکا جی کو۔۔۔ خبردار جو بچّوں کو کُچھ کہا۔۔۔ بُہت ہو لیا۔"

رمن اور بھی اکڑ کر کھڑا ہو گیا۔

"جا چلا جا، نہیں تو ملبے میں گاڑ دوں گا۔ آیا بڑا سیٹھ کا نوکر۔" رُلدُو بولا۔

بچّوں نے تالیاں بجائیں۔

گنیشار نجن کو لے کر واپس چلا گیا۔

کھڑکی میں کھڑی گیانو نے گر دھادی کی بیوی سے کہا۔ ”موئی، یہ دیواریں بھی گریں تو ریوڑیاں بانٹوں۔“

”بس، اب گری سمجھ۔۔۔“!

”یہاں ہم نیا مکان بنائیں گے۔“ رمن نے ماں سے کہا۔

”اب تو پچھلے کمرے تک دھوپ آیا کرے گی۔“ گیانو بولی۔

بچّے تالیاں بجا رہے تھے۔

سیڑھی

حسن عابدی
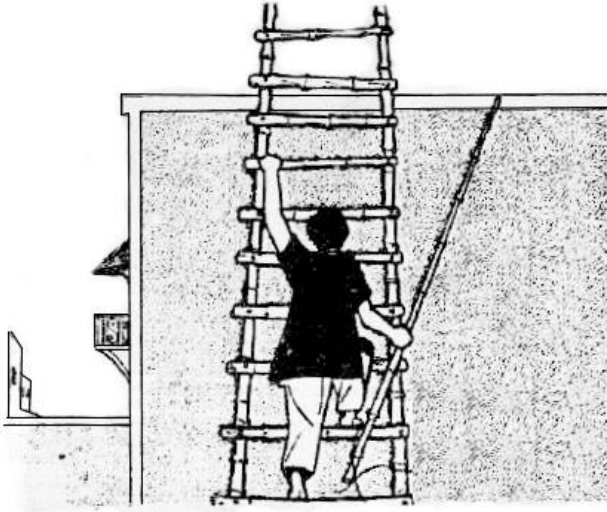
بانس کی سیڑھی کمرے کی دیوار سے لگی کھڑی تھی۔ شمّی نے چپکے سے مچھر دانی کا ڈنڈا اُٹھایا اور سیڑھی پر بندر کی طرح اُچکتا کمرے کی چھت پر چڑھ گیا۔ گُلابی سردی کا موسم اور اتوار کا دِن تھا۔ دھوپ گھر کے آنگن میں پھیل چکی تھی۔

آسمان کا رنگ گہرا نیلا ہو رہا تھا۔ ہم سب بھائی بہن ابھی ناشتا کر کے اُٹھے تھے۔ رانی اپنے کپڑوں کے بکس کو دھوپ دے رہی تھی۔بی صُغرا مونڈھے پر بیٹھی نئ کتابوں پر پرانے اخبار بڑے سلیقے کے منڈھ رہی تھیں۔

اُن کے اس سُگھڑاپے کو دیکھ کر ہم سب لڑکے اُنہیں صُغرا کی بجائے ''بی سُگھڑا'' کہتے تھے۔

سلام بھائی انگریزی کا اخبار چارپائی پر بچھائے اُسے بالکل شِین قاف کے ساتھ پڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ سلام بھائی پڑھاکو مشہور تھے اور پڑھاکو بھی کیا، اچھّے خاصے بُقراط تھے۔ ہم اُن کا نام نہ صرف ادب سے لیتے بلکہ ملازموں کے لہجے میں کبھی ''سلام صاحب'' کہتے تھے۔ کبھی قرأت کے ساتھ السّلامُ علیکم۔ بے چارے بُہت خفا ہوتے۔ اِتنے میں ابّا جان گھر میں داخل ہوئے اور آرام کُرسی کو شہتوت کے درخت کی چھاؤں میں کھینچ کر اُس پر بیٹھ گئے۔ سلام بھائی نے لپک کر اخبار اُن کی خدمت میں پیش کیا۔بی سُگھڑا جو کتاب پر پُرانے اخبار منڈھ چُکی تھیں، لَپ جھَپ اُٹھیں۔ کاغذ کے ٹکڑے زمین سے چُن چُن کر

کوڑے میں پھینکے اور کتابیں سمیٹ کر کمرے میں چلی گئیں۔ رانی بڑی دیر سے اپنے کپڑوں کی گرد جھاڑ رہی تھی۔ ابّا جان کو دیکھ کر اُس نے کپڑے دوبارہ بکس میں ڈالے اور اُنہیں دھوپ میں سُوکھنے کو چھوڑ کر جُوتوں پر پالش کرنے لگی۔ ابّا جان نے آرام کرسی پر لیٹے لیٹے گردن موڑ کر گھر کا جائزہ لیا۔ مُجھے دیکھا تو پُوچھا ''تم وہاں الماری کے پیچھے کیا کرتے ہو؟'' اب میں یہ کیسے کہتا کہ باہر میدان میں گُلی ڈنڈے کی بازی جمی ہوئی ہے۔ اپنا ڈنڈا گُلی ڈھونڈ رہا ہوں۔ مِل جائے تو یہاں سے کھِسکُوں۔ میں نے جواب دیا۔ ''ڈرائنگ کی پنسل کہیں کھو گئی ہے۔'' وہ بیزاری سے بولے۔ ''خوب لڑکے ہیں بھئی! ڈرائنگ کی پنسل بستے میں نہیں رکھتے، برتنوں کی الماری کے پیچھے ڈھونڈ رہے ہیں۔ چلو، اِدھر آؤ''!

میں ابّا جان کے پاس پہنچا۔ کہنے لگے۔ ''تشریف رکھیے۔'' میں بیٹھ گیا۔ حکم ہوا۔ ''یہ اخبار کا ایک ورق لیجیے اور آہستہ پڑھیے۔ جِن لفظوں کے معنی سمجھ میں نہ آئیں ذہن میں رکھتے جائیے۔ بعد میں مُجھ سے پُوچھ لیجیے۔۔۔ کیا سمجھے؟''

بڑے سمجھے۔'' میں نے بُجھے ہوئے دِل سے جواب دیا۔ ''بہُت اچھّا'' اور اخبار کو

آنکھوں سے قریب لے جا کر کالی لکیروں کو یوں گھورنے لگا جیسے نانی امّاں کپڑوں کی پوٹلی میں سوئی تلاش کرتی ہیں۔

ذرا دیر بعد میں نے اخبار سے نظر ہٹا کر کنکھیوں دیکھا کہ رانی بالٹی میں رنگ گھول کر اپنا دوپٹا رنگنے جا رہی تھی۔ سلام بھائی، اپنی سادہ کاپی پر پورے ایک ہفتے کی لکیریں کھینچ رہے تھے۔ صُغرا مور کے ڈھیر سارے پروں کو دھاگے میں پرو کر ان سے پنکھی بنانے میں مصروف تھی۔ ایک کبوتر تھکا ماندہ سامنے دیوار کی منڈیر پر بیٹھا اپنے پر سنوار رہا تھا۔ میری نگاہ کبوتر کے اُجلے پروں سے پھسل کر نیلے آسمان میں بھٹکنے لگی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک لال رنگ کا پتنگ اُونچے آسمان میں مزے سے ڈول رہا ہے۔ اب مُجھے شمّی کا خیال آیا جو پتنگ اُڑانے کے لیے صُبح ہی چُپکے سے چھت پر پُہنچ گیا تھا۔ شمّی نے مکان کی چھت پر پتنگ اور ڈور کے ڈھیر اکٹھے کر رکھّے تھے، بلکہ ایک پُورا "ہیڈ آفس" کھول رکھا تھا۔ اس بات کی خبر، میرے سوا گھر میں کِسی کو نہ تھی۔ شمّی کو جب بھی موقع ملتا، سیڑھی پر چڑھ کر اُوپر پہنچ جاتے اور پہروں چھُپ چھُپ کر پتنگ اُڑاتے۔ گھر میں ڈھنڈیا پڑتی تو میں

صاف بہانہ بنالیتا۔ ”یہیں کہیں ہو گا۔ ماسٹر صاحب کے یہاں سے بُلاوا آیا تھا، شاید وہیں گیا ہو۔۔۔“ وغیرہ وغیرہ۔

اچانک ابّا جان نے پوچھا۔ ”کیا دیکھ رہے ہو؟“

میں نے گھبراکر اخبار پر نگاہ ڈالی اور بولا۔

”کُچھ نہیں۔“ اب کے اُنہوں نے سوال کیا۔ ”شمّی کہاں گیا؟“ اور اس سے پہلے کہ کوئی مناسب بہانہ تراشُوں، سلام بھائی کاپی پر لکیریں کھینچتے ہوئے بڑبڑائے۔ ”ہاں، ابّا جان! شمّی کہاں گیا؟“ رانی نے اپنے رنگین دوپٹے کو نچوڑتے ہوئے وہاں سے پُکارا۔ ”دیکھو تو شمّی کہاں گیا؟“ صُغرا نے مور کے پروں کو سمیٹتے ہوئے ہانک لگائی۔ ”ذرا دیکھنا تو شمّی کہاں گیا؟“ امّاں جان آٹے میں سنے ہوئے ہاتھ لے کر باورچی خانے سے نِکل آئیں۔ بولیں۔ ”کُچھ خبر ہے، شمّی کہاں گیا؟“

مُجھے یُوں لگا جیسے شمّی کے سوا اس گھر میں، ہم سب فالتو ہیں۔ اور لوگوں کو شمّی سے محبّت جتانے کے سوا اور کوئی کام نہیں رہا۔ محبّت کا یہ دورہ اچانک اور ایک ساتھ جو سب پر پڑا تو مَیں بُری طرح بوکھلا گیا، لیکن ہمّت کر کے بولا۔ ”وُہ بات یُوں

ہُوئی کہ سلیٹ خریدنے جانا تھا۔" پھر یاد آیا کہ آج تو دُکانیں بند ہیں۔ میں نے جھٹ بات پلٹی۔ "شاید ماسٹر صاحب کے یہاں گیا ہو۔" دوبارہ یاد آیا کہ ماسٹر صاحب تو اتوار کو اپنے گاؤں جاتے ہیں اور اس سے پہلے کہ جھُوٹ پکڑا جائے، میں یہ کہہ کر باہر کی طرف لپکا کہ ابھی آتا ہُوں، دیکھوں تو سہی۔

میں مکان کے پچھلے دروازے سے چوروں کی طرح جھجکتا، چوَکنا، گھر میں داخل ہُوا اور بلّی کی طرح دبے پاؤں سیڑھی پر چڑھ کے چھت پر پہنچا۔ شمّی پتنگ کے ساتھ اُونچے آسمان میں اُڑ رہا تھا۔ میں نے سرگوشی میں کہا۔ "شامت آگئی۔ جلدی نیچے اُترو۔ ابّا جان بُلا رہے ہیں۔ کوئی بہانہ سوچ رکھّو۔"

اس کے بعد کی کہانی مُجھے رانی نے سُنائی۔ ابّا جان نے پہلے تو یہ فیصلہ دیا کہ یہ دونوں لڑکے نرے کھلنڈرے ہیں اور شمّی کو تو سمجھو کہ بس ہاتھ سے گیا۔ اس وقت مِل جائے تو کان کھینچوں۔ سخت نامعقول ہے۔"

رانی اور صُغرا سہم گئیں۔ کمال بھائی نے کہا۔ "جی ہاں۔" امّاں بولیں۔ "ٹھیک ہے۔ بچّہ ہے، ناسمجھ ہے۔"

پانچ سات منٹ بعد ابّا جان نے کہا "مَیں کَب کہتا ہُوں کہ نِرا نالائق ہے۔ پڑھنے لکھنے میں اچھّا خاصا تیز ہے۔ بس ذرر کبھی کبھی تنبیہہ کرتے رہنا چاہیے۔" رانی اور صُغرا نے اِطمینان کا سانس لیا۔ کمال بھائی بے دِلی سے بولے۔ "جی ہاں۔" امّاں نے سفارش کی۔ "ہاں ہاں، وُہ تو بھئی! بس ذرا شوخ ہے۔ تو شوخ بھی ذہین بچّے ہُوتے ہیں۔"

ذرا دیر بعد ابّا جان نے کہا۔ "میرا خیال ہے شمّی ماسٹر صاحب کے یہاں پڑھنے گیا ہو گا۔ نہیں وہیں گیا ہو گا۔ بے چارہ لڑکا! ہر وقت پڑھنا بھی کِس کام کا۔" سلام بھائی کے سوا سب کے چہرے بشاش ہو گئے۔

اب ابّا جان کا موڈ بحال ہو گیا تھا۔ وُہ صحن میں ٹہل رہے تھے اور چہک چہک کر کھیل کُود کے فائدے بیان کر رہے تھے۔ پہلے اُنہوں نے تجویز رکھّی کہ کیرم بورڈ کھیلنا چاہیے۔ پھر خُود ہی بولے۔ "چھوڑو، کیُوں نہ سَیر کو چلا جائے۔" پھر خیال آیا کہ باقاعدہ پکنک منائی جائے۔ اچانک وُہ صحن کے اس کونے میں، جہاں سیڑھی دیوار سے لگی کھڑی تھی، پہنچے۔ سیڑھی دیوار سے ہٹائی اور زمین پر لٹا

دی۔ بس اِتنا کہا کہ سیڑھی سائے میں رکھنی چاہیے۔ ورنہ دُھوپ میں پڑی پڑی خراب ہُو جاتی ہے۔

اس کے بعد کی کہانی میری زبانی سُنئے۔ میں اور شمّی چھت پر چوروں کی طرح دبکے بیٹھے تھے۔ سیڑھی تو وُہاں تھی نہیں، نیچے کیسے اُترتے۔

دھُوپ سارے بدن میں چُبھ رہی تھی اور پیاس سے زبان میں کانٹے پڑ رہے تھے۔ جُوں جُوں وقت گزرتا گیا، خوف سے ہماری حالت خراب ہو رہی تھی۔ دس منٹ، پندرہ منٹ، یہاں تک کہ پون گھنٹا گزر گیا۔ اب گھر میں بھی سبھی لوگ پریشان ہو رہے تھے۔ میں شمّی کو دِل ہی دِل میں کوس رہا تھا اور وُہ پتنگ کی ڈور کا گولا دونوں ہاتھوں میں پکڑے سہا ہُوا بیٹھا تھا۔ بس اتّفاق ہی تو ہے، ڈور کا گولا، اس کے ہاتھ سے چھُوٹ کر صحن میں گِرا اور لڑھکتا ہوا ابّا جان کے قدموں میں پہنچ گیا۔ وہ آرام کرسی پر سر جھُکائے بیٹھے تھے۔ چونک ہی تو پڑے۔ ''ہائیں، یہ کیا؟'' دیکھا تو دھاگے کا دُوسرا سِرا چھت پر ہے۔ رانی، صُغرا اور سلام بھائی لپک کر پُہنچے۔

ابّا جان جیسے سب کُچھ سمجھ گئے تھے۔ اُنھوں نے آرام کُرسی پر بیٹھے بیٹھے حکم دیا۔ ”سلام! سیڑھی ذرا دیوار سے لگانا۔“ سلام بھائی نے سیڑھی دیوار سے لگائی، تو اُنھیں حکم ہُوا۔ ”اب ذرا چھت پر چڑھو۔“ وُہ چھت پر آئے اور ہمیں دیکھ کر آواز دی۔ ”ابّا جان! وُہ دونوں تو یہاں بیٹھے ہیں۔“

ابّا جان نے اِطمینان سے جواب دیا۔ ”ہاں ہاں! مَیں جانتا ہوں، اُن سے کہو ذرا نیچے تشریف لائیں۔“ پہلے میں نیچے اُترا۔ اُس کے بعد شمّی، آخر میں سلام بھائی، جنھوں نے چوروں کی گرفتاری کا شان دار کارنامہ انجام دیا تھا۔ ابّا جان کے سامنے ہماری پیشی ہوئی۔ ہم دونوں سہمے کھڑے تھے اور وہ ملامت بھری نگاہوں سے ہمیں گھور رہے تھے۔

اس کے بعد یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ شمّی کا ”ہیڈ آفس“ ختم ہو گیا اور سیڑھی اب زمین پر لیٹی رہتی ہے۔
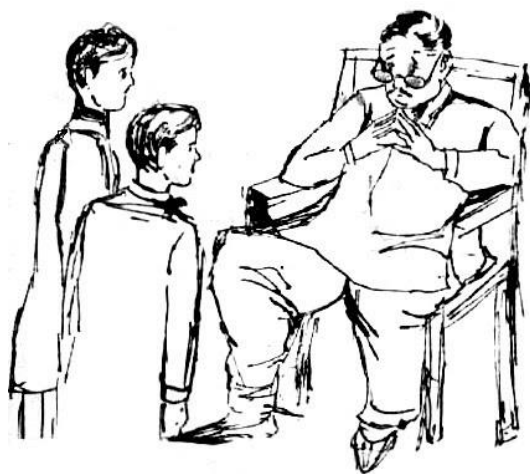
میں بھکاری نہیں

وقار بن الٰہی

بھیڑ سے ایک طرف نِکل، ایک گلی کے نکڑ پر رُک کر اُس نے رسّی اپنے گلے سے نکالی، چھابڑی کو ایک بند دکان کے تھڑے پہ رکھا اور سردی میں کسی قدر ٹھٹھرے ہوئے ہاتھوں کو بغل میں دبا کے اس نے بھیڑ کو بڑی للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ بار بار یہ بات اُس کے ذہن میں آرہی تھی۔

”یہ سب لوگ کِس خوشی سے بڑی بڑی دُکانوں پر چڑھتے ہیں۔ ڈھیروں سامان خریدتے ہیں اور کِتنی بے رُخی سے مُجھے دیکھ کر سڑک پر گُم ہو جاتے ہیں۔ آخر وہ میرے پاس کیوں نہیں آتے؟ میں بھی تو سامان بیچتا ہوں۔ پھر۔۔۔ پھر ایسی کون سی بات ہے جو کوئی بھی میری طرف متوجّہ نہیں ہوتا۔“

بغل سے ہاتھ نکال کے اُس نے جلدی سے ہاتھوں پر گرم گرم سانس چھوڑا، بڑھ کے رسّی پکڑی، اسے گلے میں پہنا، چھابڑی کو اِطمینان سے اُٹھایا اور سُوکھے لبوں کو تر کر کے پھر سے سڑک پر چل دیا۔ بازار میں ایک طرف کی دوکانوں کے سائے اتنے پھیل گئے تھے کہ دوسری طرف کی دکانوں کی پیشانی پر ہی سورج کی چمک رہ گئی تھی۔ گو اس وقت بازار میں چہل پہل بڑھ گئی تھی لیکن وُہ جانتا تھا کہ ذرا سی دیر میں یخ ہوائیں پہاڑوں سے اُتر کے اس بازار میں چلی آئیں گی تو لوگ فوراً ہی گھروں کو چلے جائیں گے۔ وُہ خُود بھی ان دو مختصر سے کپڑوں میں نہیں ٹھہر سکے گا اور بازار بند بھی تو ہو جائے گا۔ وُہ جلدی جلدی چلنے اور ساتھ ہی لوگوں کے سامنے رُکنے لگا۔ اُس نے سوچا۔ ”گھر بھی تو جلدی جانا چاہیے۔ جانے

ماں کی صحت کیسی ہو گی؟"

مُنیر بازار سے تھوڑی دور شہر کے اُس حصّے میں رہتا تھا جہاں تنگ اور تاریک گلیاں ایک جالی کی طرح بکھری ہوئی تھیں اور جہاں صدیوں پہلے بنائے گئے مکان یوں سر جھکائے کھڑے تھے۔ جیسے ابھی سجدے میں گر جائیں گے۔ ان گھروں میں آج تک سُورج کی ایک کرن بھی نہیں گئی تھی۔ مُنی کی ماں کہتی تھی کہ اس کے ابّا شہر کی چونگی کے محرّر تھے۔ ایک مرتبہ اچانک بیمار پڑے اور پھر فوت ہو گئے۔

پچھلے تین سال کی باتیں آج بھی اُس کے ذہن میں موجود ہیں۔ البتّہ پہلے کے واقعات وُہ بھُول چُکا تھا۔ اب وُہ چھٹی میں پڑھتا تھا۔ ماں صُبح سے رات گئے تک کبھی کبھی مٹّی کے تیل کے لیمپ کے پاس بیٹھ کر لوگوں کے کپڑے سیا کرتی تھی۔ مشین ان کی اپنی نہیں تھی۔ ایک اور عورت سے مانگ رکھّی تھی اس شرط پر کہ جتنی سلائی ہو گی۔ آدھے پیسے اُس مشین کی مالکہ کے ہوں گے۔ ایک مرتبہ مُنیر نے ماں سے کہا۔

”ماں۔ آخر تم اتنے سارے پیسے کیوں دیتی ہو اُسے کُچھ رکھ لیا کرو۔ اُسے کیا معلُوم تُم نے کیا سیا ہے اور کیا نہیں۔“

مُنیر کا کیا قصور، اُسے تو ایک ہم جماعت نے بتایا تھا کہ چوری کرنا بڑی اچھی بات ہے اور چوری کا مال میٹھا ہوتا ہے۔۔۔ لیکن بات ابھی اس کے مُنہ سے نکلی ہی تھی کہ ایک زور کا تھپڑ اُس کے مُنہ پر آپڑا اور وُہ چوٹ سہلاتا حیران سی نظروں سے ماں کی طرف دیکھنے لگا۔

”خبر دار۔۔۔ جو تو نے پھر ایسا سوچا مُنیر ۔ کسی کا حق دبا لیا جائے یا بد دیانتی کی جائے تو جانتے ہو پیٹ میں آگ لگ جاتی ہے۔“

اس وقت مُنیر اس بات کو سمجھا نہیں تھا۔ سمجھا وہ اب بھی نہیں تھا لیکن اتنا ضرور جان گیا کہ بات اُس نے بُری کی ہے۔

مُنیر کے صبح و شام تین ہی کام تھے۔ سکول جانا، کھیلنا اور پڑھنا۔ پہننے کے لیے اُس کے دو جوڑے تھے ایک مَیلا ہو جاتا تو ماں اُتار کے دُھلا ہُوا پہنا دیتی اور مَیلے کو اسی وقت دھو ڈالتی۔ صُبح خُود ہی وہ جاگ اُٹھتا۔ خود ہی مُنہ ہاتھ دھوتا اور چائے

میں باسی روٹی بھگو کے ناشتہ کرتا اور پھر سکول چلا جاتا۔ لوٹ کے آتا تو سورج ڈوبنے سے پہلے تک کھیلتا اور پھر لیمپ کی روشنی میں ماں کام کرتی تو وُہ بیٹھ کے پڑھتا رہتا۔

ابھی مُنیر کی عمر ہی کیا تھی لیکن وُہ جانے کیسے اس بات کو سمجھ گیا تھا کہ جب تک وُہ پڑھے گا نہیں اس وقت تک وہ اپنی ماں کے دکھ دُور نہیں کر سکے گا۔ شاید اسی لیے وُہ پچھلی دونوں کلاسوں میں اوّل آیا تھا۔ مُنیر کے ایک دو دوست ایسے بھی تھے جو اسی کی طرح بے حد غریب تھے۔ سکول سے واپس جا کر وُہ بازاروں اور بس کے اڈوں پر کُچھ نہ کُچھ بیچتے اور تب پیٹ بھرتے تھے۔ مُنیر کو بھی ایک دِن خیال آیا کیوں نہ وُہ بھی ایسا ہی کیا کرے۔ بڑی پُر اُمّید نگاہوں سے اُس نے ماں کی طرف دیکھا اور سب کُچھ کہہ دیا۔ ماں کے چلتے ہاتھ یک لخت رُک گئے۔ اُس نے پیچھے ہٹ کے مُنیر کو سینے سے چمٹایا اور دُکھ بھرے لہجے میں کہنے لگی: ”میں کوئی مر تو نہیں گئی مُنیر !میرے جیتے جی تُجھے گرم ہوا چھُو جائے یہ کیسے ہو سکتا ہے پگلے۔“

اور ٹپ سے گرم گرم آنسو اُس کے گالوں پر آن گرا اُس نے فوراً سر اُٹھا کے اوپر دیکھا لیکن ماں نے چہرہ دوسری طرف پھیر لیا تھا۔

مُنیر اسی گندی گلی میں رہتا۔ غلیظ سکول میں پڑھتا اور اچھے اچھے خواب دیکھتے دِن کاٹ رہا تھا کہ اچانک اس کی ماں بیمار ہو گئی۔ کبھی کبھی شدید کھانسی آتی اور بخار بھی ہو جاتا تھا۔ لیکن اس مرتبہ تو بُخار بُہت ہی تیز تھا اور کھانسی تو اس کی ماں کو جیسے روئی کی طرح دھنک کر رکھ گئی تھی۔ پہلے وُہ بیماری کی حالت میں بھی کام کرتی رہتی تھی۔ پر اب اُس سے اُٹھا بھی نہ جاتا تھا۔ ایک دن وُہ مُنیر کے لیے روٹی پکانے لگی تو لڑکھڑا کے گری اور کتنی دیر بے ہوش رہی۔ مُنیر چپ چاپ ماں کے پاس بیٹھا رہتا اور سوچتا کہ کیا کرے۔ کبھی کبھی وہ گھٹنوں میں سر دے کے رو لیا کرتا۔

آج سکول سے چھُٹی تھی۔ ماں کی طبیعت ویسی ہی تھی۔ لیکن کھانسی کم ہو گئی تھی۔ مُنیر نے چائے پی اور پھر ماں کو بتائے بغیر چُپ چاپ گھر سے نکل آیا اور سیدھا اُسی دوست کے گھر جا نِکلا جو سامان بیچا کرتا تھا اور جس نے کل شام اس سے

وعدہ کیا تھا کہ آج کے دن وُہ بازار نہیں جائے گا۔ مُنیر اس کی چھابڑی لے جائے، جو کُچھ بکا، اس کا نفع مُنیر ہی کا ہو گا۔

دوست سے مختلف چیزوں کے بھاؤ یاد کر کے وہ چھابڑی لیے چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتا کر چلا آیا۔ وہ جانتا تھا کہ ماں ایک تو بیمار ہے دوسرے میرے غائب ہو جانے پر فکر مند بھی ہو گی۔ لیکن پھر بھی وہ خُوش تھا۔ آج وُہ ڈھیر سارے پیسے کمائے گا اور شام ہوتے ہی گھر جا کر ماں کی جھولی میں ڈھیر کر دے گا بلکہ اُس نے سوچ لیا تھا کہ اب وُہ ماں کو بالکل کام نہیں کرنے دے گا۔

بازار میں پہنچ کے پہلے تو وُہ بڑی دیر تک فٹ پاتھ پر ایک طرف کھڑا رہا۔ پھر وہاں سے ہٹ کر ایک کھمبے کے ساتھ آ کھڑا ہوا اور دوپہر تک وہیں کھڑا رہا۔ لیکن ان تین چار گھنٹوں میں اس نے صرف ایک کنگھی بیچی۔ دونی سامنے ایک کونے میں رکھی تھی۔ اُسے بھُوک بھی لگ رہی تھی لیکن کھانے کے لیے اس کے پاس پیسے کہاں تھے۔

پھر اچانک اُسے دوست کا بتایا ہوا طریقہ یاد آ گیا۔ کھمبے کو چھوڑ کر وہ نیچے اُترا اور

سڑک پر چلتے ہوئے لوگوں کے پاس رُکنے لگا ممکن ہے ان میں سے کوئی اس سے کُچھ خرید لے۔ رُک وُہ ضرُور جاتا تھا لیکن مُنہ سے بولنے کی ہمّت ہی نہ پڑتی تھی۔ ہمّت پڑتی بھی تو وُہ کہتا تھا۔ اس سے پہلے تو اُس نے کبھی ایک جُملہ مُنہ سے نہ نِکالا تھا۔ اسی طرح چلتے چلتے وہ ایک چوک سے دوسرے چوک تک نکل گیا۔ تقریباً ہر ایک شخص کے پاس گیا۔ ہر ایک کے پاس رُکا لیکن کوئی پہلو بچا کے نکل گیا، کِسی نے تیز نظروں سے گھُورا، کِسی نے مذاق اُڑایا اور کِسی نے اس زور سے چھابڑی کو دھکا دیا کہ مُنیر گِرتے گِرتے بچا۔ دوسری مرتبہ وُہ سڑک پر گیا تو ایک کنگھی اور بِک گئی۔ مُنیر کو بڑی خوشی ہوئی اور وہ اس خوشی میں تیز تیز قدموں سے چلنے لگا۔ لیکن یہ ڈھارس عارضی ثابت ہوئی۔۔۔ اگلے دو پھیروں میں وُہ کُچھ بھی نہ بیچ سکا۔ اسے بڑی مایوسی ہوئی۔

چھابڑی کا وزن اِتنا زیادہ نہ تھا لیکن پھر بھی اس بوجھ سے مُنیر کے کندھے شل ہو گئے تھے۔ اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وُہ رسّی اب تیز چاقو کی طرح اس کے کندھے کو کاٹتی ہوئی نیچے اُترتی چلی جا رہی ہے۔ اس کے پاؤں مَن مَن کے ہو

رہے تھے اور ٹانگیں تھکن کے بعد ٹھنڈی ہوا کھا کھا کے شل ہوئی رہی تھیں۔ آنکھیں مایوسی کے عالم میں رودینے کو تھیں اور ہونٹوں پر پپڑی جم چکی تھی۔ وُہ تو ہونٹوں کو تر کرنا بھی بھُول گیا تھا۔ سارے چہرے پر یوں لگتا تھا جیسے کوئی ہلدی کا پانی اُنڈیل گیا ہو۔ اچانک اُسے ماں کی یاد آئی۔ جانے وہ کیسی ہو گی۔ کہیں تنگ آ کے وہ بخار کی حالت میں اُسے ڈھونڈنے نہ لگ پڑے۔۔۔ لیکن جب اُس کی نظر چھابڑی پر پڑی تو چار آنے اُس کا مُنہ چڑا کے رہ گئے۔ اس نے تھکی نظروں سے سب لوگوں کو دیکھا اور پھر سے چل پڑا۔

اب اُس نے سوچ لیا تھا کر اپنی گلی تک ہی جائے گا۔ اور پھر دوست کے ہاں سے ہوتا ہوا گھر چلا جائے گا۔ یہ ایک آنہ نفع ہی اُسے کافی ہے۔ لیکن اب مایوسی اور تھکن سے اُس کے پاؤں اُٹھ ہی نہیں رہے تھے۔ گلی سے کُچھ ادھر وہ اچانک ایک آدمی کے سامنے جارُکا۔

"بابو جی۔۔۔ کیا خریدو گے؟" یہ پہلا فقرہ تھا جو دِن بھر میں اُس نے کِسی شخص سے کہا تھا۔ بابو کوئی شریف آدمی تھا۔ اُس نے گھورا بھی نہیں کُچھ کہا بھی نہیں۔

پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالے۔ بڑے غور سے مُنیر کو دیکھنے لگا۔ جیب سے ہاتھ نکال کے اُس کی چھابڑی کو دیکھنے لگا۔ مُنیر کی نگاہیں جھک گئیں۔ اس کا دِل دھڑک اُٹھا۔ اگر اس بابو نے بھی کُچھ نہ خریدا تو۔۔ بابو نے بڑے پیار سے اس کے سامنے سے ایک کنگھی اُٹھائی۔ انگلی پھیر کے کنگھی کے دندانوں کو دیکھا۔ جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اٹھنّی نکالی چھابڑی میں رکھی اور مُنیر کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیر کے چل دیا۔۔۔ مُنیر کی آنکھیں چمکیں۔ اُفّوہ! آٹھ آنے۔۔۔ اب اُس کے پاس دو تین آنے ہو جائیں گے۔ دو روٹیاں بن جائیں گی۔۔۔ لیکن۔۔۔ اچانک اُسے خیال آیا۔ بڑی کنگھی کے تو چار آنے بنتے ہیں اور یہ آٹھ آنے ہیں۔ مجھے۔۔۔مجھے چار آنے لوٹانے ہیں۔

"دیکھو بیٹے۔۔۔ جو بددیانتی کرتا ہے نا اُس کے پیٹ میں آگ لگ جاتی ہے۔ پیٹ میں آگ۔۔۔" جیسے کوئی اچانک پُکار اُٹھا۔ مُنیر نے تڑپ کے پلٹ کے بابو کو تلاش کیا اور تیز تیز چلتا لوگوں سے بچتا اس کے پاس جا پہنچا۔۔۔۔

"بابو جی۔ آپ کے چار آنے۔۔۔" بابو نے رُک کے مُنیر کی طرف دیکھا اور

پھر مُسکرادیا۔۔۔

"تم رکھ لو، میں نے تُمھیں ہی دیے ہیں۔"

اور ایک بار پھر کوئی اس کے دل میں پُکار اُٹھا۔ "بیٹے! خیرات تو بھکاری مانگتے ہیں۔۔۔"اس نے زبردستی چونی بابو کے ہاتھ میں تھمادی۔

"میں کوئی بھکاری تو نہیں بابو صاحب"!

بابو نے تیزی سے بھیڑ میں گم ہوتے ہوئے اُس بچّے کو دیکھا اور جی چاہا، بھاگ کر اُسے گلے لگالے لیکن۔۔۔۔ مُنہ غائب ہو چکا تھا۔۔۔۔

کھوٹا روپیہ

حسن عابدی

اِس کہانی کا مسخرا ایک کھوٹا روپیہ ہے اور روپیہ بھی چوری کا یعنی بالکل ہی کھوٹا۔

امّی کے صندُوقچے میں ڈھیروں ریز گاری پڑی رہتی ہے۔ میں نے وُہ روپیہ وہاں سے نِکالا تھا۔

حمید پرُویژن سٹور کے سامنے پھلوں کی دُکان ہے۔ میں نے آدھ پاؤ انگور

خریدے اور روپیہ پھل والے کے سامنے بڑے رُعب سے پھینکا۔ روپیہ لکڑی کے تختے پر ٹھک سے جا کر گِرا۔ پھل والا انگور کی تھالی سے گلے سڑے دانوں کو چُن کر الگ کر رہا تھا۔ اُسی طرح سر جھُکائے اور روپے کی طرف دیکھے بغیر بولا۔

"باؤ! روپیہ اُٹھالو۔ یہ کھُوٹا ہے۔"

مُجھے ایسا لگا جیسے راہ چلتے ایک روپیہ جیب سے گِر گیا ہو۔ سخت شرمندگی ہوئی۔ انگور پھل والے کے سامنے رکھ دیے، ماتھے سے پسینا پونچھا اور اُلٹے پاؤں واپس ہوا۔

دوستو، تُم سے کیا چوری۔ میں اپنے ہم جولیوں میں ایک نمبر چالاک مشہور ہوں۔ کوئی مُشکل آ پڑے تو دوسرے پکڑ لیے جاتے ہیں۔ لیکن میں بہانا کر کے صاف بچ نِکلتا ہوں۔ البتّہ آج اس کھوٹے روپے کے ہاتھوں اتنا شرمندہ ہُوا کہ بس کُچھ نہ پُوچھو۔ خیر صاحب، روپیہ جیب میں ڈال کر میں نے اپنے دِل کو ڈھارس دی اور کہا۔ "میاں اِتنے اُداس کیوں ہوتے ہو۔ ذرا ہمّت سے سے کام لو۔ تمہارے لیے ایک کھوٹا روپیہ چلا دینا کون سی بڑی بات ہے۔" یہ بات کہی اور جی میں ٹھان

لی کہ یہ روپیہ ضرور چلاؤں گا، چاہے اس کے آگے موٹر کا انجن ہی کیوں نہ لگانا پڑے۔ حمید پرُویژن سٹور میں رنگا رنگ پنسلوں کا تازہ سٹاک آیا تھا۔ میں نے دُکان میں جھانکا تو سیلز مین بھی کوئی نیا آدمی نظر آیا۔ شاید پنسلوں کے تازہ سٹاک میں سے بر آمد ہوا تھا۔ میں ہنستا ہُوا کاؤنٹر پر پہنا۔ سیلز مین سے کہا۔ ”ذرا وُہ پنسلیں دِکھایئے گا۔ اُوپر۔۔۔ جی ہاں! وُہی۔ بھلا کتنے کی ہوں گی؟۔۔۔ نَو نَو آنے؟ ارے! بڑی مہنگی ہیں۔ چلیے کوئی بات نہیں۔۔۔“

میں نے ایک پنسل لے کر جیب میں رکھّی اور دھڑکتے ہوئے دِل کے ساتھ روپیہ سیلز مین کے ہاتھ میں رکھ کر ٹافیوں کے مرتبان کی طرف مُڑ گیا۔

”دیکھیے جی! ریز گاری نہیں ہے، آپ کے پاس؟ یہ روپیہ، معاف کرنا، کھوٹا ہے۔“ سیلز مین نے کہا۔

میں نے تھوڑی سی جرح کی لیکن بے فائدہ۔ آخر پنسل کاؤنٹر پر رکھ کر وہاں سے بھی واپس ہوا۔۔۔ امّی کے صندُوقچے سے میں نے بارہا پیسے چُرائے تھے لیکن اِتنی شرمندگی بھلا کاہے کو اُٹھائی تھی۔ یُوں معلوم ہوتا جیسے وہ کھُوٹا روپیہ مُجھ سے

اُن تمام ریز گاریوں کا اِنتقام لے رہا تھا جو میں نے گاہے گاہے چُرائیں تھیں۔ اس کے بعد میں نے ایک مونگ پھلی والے کو گھیرا۔ پھر ایک گزک والے کو، لیکن ہر ایک نے میرے بھولپن پر ترس کھا کر روپیہ واپس کر دیا۔

شام ہوئی تو میں نے چند آنے جیب میں ڈالے اور روپیہ مُٹھی میں دبا کر شہر کی بھیڑ بھاڑ میں اُسے چلانے کے لیے نِکلا۔ جلد ہی بَس مل گئی۔ بازار میں پہنچ کر میں تو جیسے ہجوم میں کھو گیا۔ سڑک پر قُمقموں کی دو رویہ قطاریں اور جگ مگ کرتی دُکانیں کتنی بھلی لگتی ہیں۔ ٹرکوں، موٹروں اور ہر طرح کی گاڑیوں کا تانتا بندھا رہتا ہے اور فُٹ پاتھ سے گزرنے والے بس اپنی دُھن میں ہر آن چلتے ہی رہتے ہیں۔ میں پہلے ایک دُکان کے سامنے ٹھٹکا، پھر دُوسری دُکان کے سامنے، یہاں تک کہ ایک سے دُوسرے سِرے تک تمام دُکانوں کو تکتا ہوا گُزر گیا۔ لیکن بھرے بازار میں کھوٹا روپیہ چلانے کی ہمّت نہ ہوئی۔

اب رات گہری ہوتی جارہی تھی۔ ٹریفک کا ریلا مدّھم ہو چلا تھا اور راہ گیروں کی بھیڑ چھٹ رہی تھی۔ میں بس اسٹاپ پر پہنچ کر بجلی کے کھمبے کے قریب کھڑا ہو

گیا اور دیر تک اپنی حالت پر افسوس کرتا رہا۔ کھوٹے روپے نے مجھے اِتنا پریشان کیا تھا اور ابھی کیا۔ اصل تو اضع تو گھر پُہنچ کر ہو گی۔

اچانک کسی نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھّا۔ میں چونک پڑا۔ پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ ایک لڑکا ٹوکری ہاتھ میں لیے کھڑا تھا۔ ٹوکری میں کُچھ کنگھیاں سجی ہوئی تھیں، کُچھ ٹافیاں اور چند جوڑے جُوتے کے فیتے۔ وُہ کہہ رہا تھا "کوئی چیز خرید لو۔۔۔"

ایک خیال بجلی کی لہر کی طرح میرے ذہن میں آیا۔ میں نے دِل میں کہا۔ "لو! کام بن گیا، لڑکے کی ٹوکری سے ایک کنگھی اُٹھائی اور کھوٹا روپیہ اِطمینان سے اُس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ لڑکے نے روپے کو دیکھے بغیر مُٹھّی میں دبا لیا۔ ٹوکری زمین پر رکھ دی اور قمیص کی جب سے ریز گاری نکالنے لگا۔ اس نے اپنے سامنے چھوٹے سکّوں کا ایک ڈھیر لگا لیا۔ اُنہیں ایک بار گِنا، دو بار گِنا اور پھر کئی بار گِن ڈالا لیکن کُل رقم پونے تیرہ آنے سے آگے نہ بڑھتی تھی اور مُجھے ایک کھوٹے روپے، میرا مطلب ہے ایک روپے میں سے تیرہ آنے واپس ملنے چاہیں تھے۔ اتنی دیر میں بس آگئی۔ میں نے کہا "چلو، رہنے دو۔ ایک پیسا کم ہی سہی۔" اور

ریز گاری سمیٹ کر بس میں جا پہنچا۔

پیچھے مُڑ کر دیکھنے کی ہمّت نہ پڑتی تھی۔ بس چلی تو جان میں جان آئی لیکن معلُوم نہیں کیوں کھوٹا روپیہ چلانے سے جو خوشی ہو سکتی تھی، وہ نہ ہوئی۔ جانے کیوں، دِل کُچھ بوجھل سا اور طبیعت بُجھی بُجھی سی تھی۔ کنگھی والے لڑکے کا چہرہ آنکھوں کے سامنے آتا تو یوں لگتا، جیسے میں شہر کے پُر رونق بازار میں جیب کاٹتے ہوئے پکڑا گیا ہوں۔ مُسافروں کی باتیں اور بھانت بھانت کی آوازیں مُجھے کہیں دُور سے آتی ہوئی سُنائی دے رہی تھیں۔ اب کنڈکٹر پچھلی نشستوں کے مسافروں کو ٹکٹ بانٹ رہا ہو گا۔ اچانک شور و غل میں کنڈکٹر کی آواز سُنائی دی ”اور پیسے نہیں ہیں، تو بس سے نیچے اُتر جاؤ۔ کھوٹا روپیہ دے کر تُم مجھے ٹھگنا چاہتے ہو؟ یہ نہیں ہو گا۔“

میں نے پلٹ کر دیکھا، وہی لڑکا مسافروں کے ہجوم میں کنڈکٹر کے سامنے کھڑا اُس کا مُنہ تک رہا تھا۔ اس کے چہرے پر کوئی شرمندگی اور پریشانی نہ تھی۔ جُوں ہی اگلے اسٹاپ پر بَس رُکی، وُہ کِسی سے کُچھ کہے بغیر بس سے نیچے اُتر گیا۔

اور میں اُس لڑکے کے روپے کا چور اپنی سیٹ پر بیٹھا سوچ رہا تھا کہ اب کیا ہو گا۔ لڑکے کی تمام دِن کی محنت میری جیب میں تھی۔ اب وُہ خالی ہاتھ گھر جائے گا۔ ماں گھر کے دروازے پر اُس کی راہ تک رہی ہو گی۔ شاید آج رات دونوں ماں بیٹے روپے کے بغیر بھُوکے رہیں اور صُبح تک سو نہ سکیں۔ شاید لڑکا کل کام پر نہ جائے اور وُہ ننھّی ٹوکری جس میں کنگھیاں اور ٹافیاں اور فیتے سجائے گئے ہیں، گھر کے طاقچے میں شام تک پڑی پڑی گرد سے اَٹ جائے۔

بس اگلے اسٹاپ پر جُوں ہی رُکی میں نیچے اُتر پڑا اور پچھلے اسٹاپ کی جانب دیوانوں کی طرح تیزی سے دوڑا۔ لڑکا مُجھے مل گیا۔ بجلی کے کھمبے کے نیچے اپنے سامان کی ٹوکری اُٹھائے وُہ چُپ چاپ کھڑا تھا۔ اُس کے چہرے پر کوئی ملال نہ تھا۔ البتّہ پیشانی محنت کے غرور سے روشن تھی۔

اُس نے مُجھے دیکھتے ہی پہچان لیا اور مُسکرایا۔ میں اُس سے لپٹ گیا۔ اُس کی مُٹھّی کھولی اور پُورے سولہ آنے ہتھیلی پر رکھ کر کہا۔ ”دوست یہ لو اپنی امانت اور مُجھے معاف کر دو۔“

کھوٹا روپیہ لڑکے نے مُجھے واپس کر دیا، بولا۔ ”کسی اور کو تو دھوکا نہ دو گے ؟“

”ہر گز نہیں۔۔۔“ اور وُہ کھُوٹا روپیہ میں نے اپنے بازو کی پوری طاقت سے دُور اُچھال دیا۔

میں نے سوچا۔ ”یہ بڑی بُری بات ہو گی اگر کھوٹا روپیہ بازار میں چلتا رہے اور ایک دن اسی طرح رات گئے کسی ایسے آدمی کے ہاتھ لگ جائے جو اُس کو تمام دِن کی روزی سمجھے اور بے چارہ بھُوکا رہے۔“ میری جیب خالی تھی، اس لیے پیدل چل کر گھر پہنچا لیکن دِل پر کوئی بُوجھ نہ تھا۔ طبیعت پر تکان نہ تھی۔ سارا بدن ہلکا پھُلکا لگ رہا تھا جیسے ہوا میں اُڑ کر گھر پہنچا ہوں۔ میں امّی سے لپٹ گیا اور خُوشی کے آنسو پی کر بولا۔ ”امّی! اب میں کبھی چوری نہیں کروں گا اور پیسے کبھی فضول خرچ نہ کروں گا اور کبھی کِسی کو دھوکا نہ دُوں گا۔

مقبول جہانگیر

عرصہ گزرا، چین کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں دو لڑکیاں رہتی تھیں۔ نام تو اُن کے کُچھ اور تھے مگر اُن کی مائیں پیار سے اُنہیں چنبیلی اور چاندنی کے نام سے پُکارا کرتی تھیں۔۔۔۔ اور بھئی! وہ تھیں بھی بڑی خوبصورت اور پیاری پیاری۔۔۔ دونوں آپس میں اتنی گہری سہیلیاں تھیں کہ ہمیشہ ایک ساتھ کھانا

کھاتیں، اکٹھی کھیلتیں اور اکٹھی پڑھنے جاتیں۔ گاؤں میں تقریباً روزانہ ہی کسی نہ کسی گھر میں شادی بیاہ اور دعوتیں ہوتی تھیں۔ چنبیلی اور چاندنی کو دعوتوں میں جانے کا بڑا شوق تھا۔ جب بھی کبھی اس قسم کی کوئی دعوت ہوئی وُہ سب سے پہلے وہاں موجود ہوتیں۔

وقت گزرتا رہا۔۔۔ چنبیلی اور چاندنی جوان ہو گئیں اور آخر وہ دِن بھی آیا جب ان دونوں سہیلیوں کی ایک ساتھ ہی شادی کر دی گئی۔ دونوں کے خاوند آپس میں حقیقی بھائی تھے اور وُہ اس گاؤں سے کچھ دُور ایک دوسرے گاؤں میں رہتے تھے۔ شادی بیاہ کی رسمیں ختم ہونے کے بعد، دولھاؤں نے اپنی دلھنوں کو ڈولی میں بٹھایا اور اُنہیں اپنے گھر لے گئے۔

چنبیلی اور چاندنی اپنے نئے گھر میں آکر بڑی خوش تھیں۔ اُن کے خاوند بڑے شریف اور محنتی نوجوان تھے۔ ساس بھی نیک اور ہنس مکھ عورت تھی اور وُہ ان سے پیار محبّت سے پیش آتی۔ چنبیلی اور چاندنی بھی اس کا بڑا ادب کرتیں اور ہمیشہ اُس کا حکم مانتیں تھیں۔ لیکن جب اُنہیں اپنے گاؤں کی دعوتوں کا خیال آتا تو وہ

اداس ہو جاتیں۔ بھاگی بھاگی اپنی ساس کے پاس جاتیں اور اس سے کہتیں۔
”پیاری امّاں! اگر آپ اجازت دیں تو چند دِنوں کے لیے ہم اپنے گاؤں چلی جائیں۔ وُہ گاوں جہاں ہم نے اپنا سنہرا بچپن بسر کیا ہے، جس کی گلیوں میں کھیل کر ہم جوان ہوئیں، جہاں ہماری پیاری سہیلیاں رہتی ہیں۔ جہاں ہمارے پیارے ماں باپ رہتے ہیں، جنھوں نے پال پوس کر ہمیں اتنا بڑا کیا۔“

ساس فوراً اُنہیں جانے کی اجازت دے دیتی اور کیوں نہ دیتی! دونوں لڑکیاں اس کی خدمت بھی تو بُہت کیا کرتی تھیں اور جب وہ بیمار پڑتی تو ساری ساری رات اُس کی تیمار داری کرتیں۔ لیکن اِن سب باتوں کے باوجود چنبیلی اور چاندنی کا آئے دن اپنے گاؤں جانا وہ اچھا نہیں سمجھتی تھی۔ شروع شروع میں تو وہ اُنہیں خوشی سے جانے کی اجازت دے دیتی، لیکن ہر تیسرے چوتھے روز وُہ گاؤں جانے لگیں تو وُہ بڑی پریشان ہوئی۔ اس نے کئی بار اُنہیں سمجھایا کہ اب تُمہاری شادی ہو گئی ہے۔ بچپنا چھوڑ دو۔ گھر کے کاموں میں دِل لگاؤ۔ لیکن دونوں لڑکیوں کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔

ایک روز ساس اپنے دِل میں کہنے لگی۔ ”یہ کیا مُصیبت ہے! میری بہوئیں اپنے گھر میں ٹِک کر بیٹھنا پسند نہیں کرتیں۔ انہیں ہر وقت دعوتوں اور سہیلیوں سے ملنے کی دُھن لگی رہتی ہے۔ کوئی ایسی ترکیب سوچی جائے کہ ان کی یہ عادت چھُوٹ جائے۔“

آخر سوچتے سوچتے اس کے دماغ میں ایک بڑی اچھی ترکیب آئی۔

چند روز بعد چنبیلی اور چاندنی خوبصورت لباس پہن کر اپنی ساس کی خدمت میں پہنچیں اور کہا:

”امّاں جان! اگر آپ فرمائیں تو ہم اپنے گاؤں چلی جائیں۔ ہماری ایک سہیلی کی شادی ہے اور ہمیں اس میں ضرور شریک ہونا ہے۔“

ساس نے جواب دیا۔۔۔ ”ہاں ہاں۔ میری بچّیو! خوشی سے جاؤ لیکن جب واپس آؤ تو میرے لیے دو تحفے لیتی آنا۔ اگر تُم وُہ تحفے نہ لائیں اور خالی ہاتھ واپس آئیں تو میں زندگی بھر تم سے نہیں بولوں گی۔“ ”امّاں جان! آپ فرمائیں تو۔ جو چیز کہیں گی، وہی لائیں گی۔“ دونوں لڑکیوں نے جواب دیا۔

"اچھا تو پھر غور سے سنو۔" ساس کہنے لگی۔ "چنبیلی! میرے لیے کاغذ میں آگ لانا اور چاندنی تم کاغذ میں ہوا لے کر آنا۔ بس یہی دو چیزیں چاہتی ہوں۔"

دونوں لڑکیاں اپنے گاؤں جانے کے لیے اتنی بے چین تھیں کہ اُنھوں نے ساس کے الفاظ پر غور ہی نہ کیا اور سوچے سمجھے بغیر کہہ دیا۔

"ہاں ہاں پیاری امّاں! آپ نے جو فرمایا ہے ہم وہی لائیں گئے۔" پھر اُنھوں نے اپنی ساس کو سلام کیا، خاوندوں سے اجازت مانگی اور اپنے گاؤں کی طرف ہنستی کھیلتی روانہ ہو گئیں۔

راستے میں اچانک چنبیلی کو ساس کے الفاظ یاد آ گئے اور وہ سوچنے لگی کہ میں کاغذ میں آگ کیسے لے جاؤں گی۔ یہ بات تو بالکل نا مُمکن ہے۔ وہ سڑک کے کنارے بیٹھ کر زار و قطار رونے لگی۔ یہی خیال چاندنی کو بھی آیا۔ بھلا وہ کِس طرح ہوا کو کاغذ میں لے جاسکتی ہے۔ یہ بات پہلی بات کی طرح نا ممکن تھی۔۔۔ وُہ بھی اداس ہو گئی اور چنبیلی کے برابر ہی بیٹھ کر رونے لگی۔

دونوں بیٹھی رو رہی تھیں کہ ایک چھوٹی سی بچّی قریب کے ایک کھیت میں سے

نکلی اور ان کے پاس آ کر بولی۔ "اس طرح رونے دھونے سے کیا فائدہ!۔۔۔ تم مُجھے اپنی مشکل بتاؤ، شاید میں تُمہاری کُچھ مدد کر سکوں۔"

چنبیلی اور چاندنی نے شروع سے آخر تک ساری داستان اس لڑکی کو سنائی، جسے سُن کر وُہ کہنے لگی۔

"تم نے بہت بے وقوفی کی جو ایسا وعدہ کر لیا۔ اچھّا خیر، ہم مل کر سوچیں گی کہ اس معمّے کو کیسے حل کیا جائے۔ آؤ میرے گھر چلو۔"

تینوں لڑکیاں مکان کی ڈیوڑھی میں بیٹھ گئیں اور سوچنے کی کوشش کرنے لگیں۔ لیکن جتنا زیادہ سوچتیں اتنا ہی زیادہ اُنہیں یہ باتیں مُشکل نظر آتیں۔ اُن کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کاغذ میں آگ اور کاغذ میں ہوا کِس طرح لے جائی جا سکتی ہے؟

اچانک اُن کی نئی سہیلی خُوشی سے اُچھل پڑی اور دوڑتی ہوئی اپنے گھر میں گھس گئی۔ چند منٹ بعد واپس آئی تو اُس کے ہاتھ میں ایک لالٹین تھی، جو کاغذ کی بنی ہوئی تھی اور اُس کے اندر ایک موم بتّی جل رہی تھی۔

"دیکھو۔۔۔!" وُہ چِلاّ کر بولی۔ "کاغذ کے اندر آگ۔۔۔"!

"آہا! کیسی عجیب بات ہے!" چنبیلی نے خوش ہو کر کہا۔ "یہی وُہ تُحفہ ہے جو میری ساس نے منگوایا تھا۔"

لیکن چاندنی اسی طرح اداس بیٹھی رہی۔ اس کے مَن کی مُراد پوری نہ ہوئی تھی۔ یکایک وُہ لڑکی پھِر خوشی سے اُٹھی، بھاگتی ہوئی اپنے گھر میں گئی اور جب باہر نِکلی تو اس کے ہاتھ میں کاغذ کا بنا ہوا ایک پنکھا تھا۔

"دیکھو۔۔۔!" وُہ بولی۔ "کاغذ میں ہَوا۔"

"آہا! کیسی عجیب بات ہے!" چاندنی نے خوش ہو کر کہا۔ "یہی وُہ تُحفہ ہے جو میری ساس نے منگوایا تھا۔"

چنبیلی اور چاندنی نے اپنی نئی سہیلی کا بُہت بہت شُکریہ ادا کیا اور شادی میں جانے کی بجائے واپس اپنے گھر آ گئیں۔

ساس نے اُنہیں دیکھا تو حیرت سے بولی۔ "ارے! اِتنی جلدی آ گئیں! شادی میں

نہیں گئیں؟"

"جی نہیں۔" اُنہوں نے کہا۔ "ہم نے سوچا کہ ہماری پیاری امّاں نے جو تُحفے منگوائے ہیں وُہ جلد سے جلد پہنچا دیں۔"

چنبیلی نے اپنا ہاتھ اونچا کر کے ساس کو کاغذ کی لالٹین دکھائی، جس کے اندر موم بتّی جل رہی تھی اور پھر چاندنی نے کاغذ کا پنکھا جھَلا تو ہوا ساس کے چہرے پر لگی۔

"شاباش۔۔۔!" اس نے کہا۔ "اِس بار تو تُم جیت گئیں، لیکن یاد رکھو۔ اگر اب تُم نے کہیں جانے کا نام لیا تو ایسے تُحفے لانے کو کہوں گی جو تُم کبھی نہ لا سکو گی۔"

چنبیلی اور چاندی بولیں۔ "پیاری امّاں! جب آپ کہیں گی تب ہی ہم اس گھر سے قدم باہر نکالیں گے۔ آپ کی خوشی میں ہماری خوشی ہے۔"

بوڑھی ساس نے اُنہیں دُعا دی اور پھر وُہ دونوں ہنسی خوشی رہنے لگیں۔

درزی اور شہزادہ

خرّم سعید

مصر کے شہر اسکندریہ میں ایک درزی رہتا تھا۔ نام تھا عبید اللہ۔ اُس کی دکان میں بہت سے کاریگر کام کرتے تھے۔ ان میں سعُود نامی ایک نوجوان بھی تھا۔ لمبا تڑنگا، بے حد خوب صورت، محنتی اور فرماں بردار۔ پتا نہیں اُس کے ماں باپ کون تھے۔ عبید اللہ نے اُسے بچپن سے پالا تھا اور اپنی اولاد کی طرح چاہتا تھا۔

سعُود میں بہت سی اچھّائیاں تھیں، مگر ایک بُرائی بھی تھی۔ اُسے اپنی خوب صُورتی پر بڑا گھُمنڈ تھا۔اس کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ وہ کسی بادشاہ کا بیٹا ہے۔بس سوتے جاگتے یہی سپنے دیکھا کرتا۔

ایک دن مصر کے بادشاہ کا وزیر اسکندریہ آیا۔عبید اللہ بڑا نامی درزی تھا۔بڑے بڑے امیر اور سرکاری افسر اس سے کپڑے سلواتے تھے۔وزیر نے اسے محل میں بلوایا اور کہا۔"ہمارے چغے کا دامن تھوڑا سا پھٹ گیا ہے۔اس طرح رفو کرنا کہ کوئی پہچان نہ سکے۔"عبید اللہ چغا (چوغہ) لے کر دکان پر آیا اور سعُود کو رفو کرنے کے لئے دے دیا، کیونکہ تمام کاریگروں میں وہی سب سے ہوشیار اور تجربہ کار تھا۔

دکان کی چابیاں سعُود کے پاس رہتی تھیں۔ صبح کے وقت وہی دکان کھولتا اور شام کو وہی بند کرتا۔اس دن شام کو جب سب کاریگر چلے گئے اور سعود دکان بند کرنے لگا تو اس کے دل میں ایک عجیب خواہش پیدا ہوئی۔اس نے سوچا چغا پہن کر دیکھوں تو سہی کیسا لگتا ہوں۔ اس نے کھونٹی سے چغا اتارا اور پہن کر آئینے

کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ خوب صورت تو تھا ہی، چغے نے حسن میں چار چاند لگا دیے۔

"میں شہزادہ ہوں۔ میں سچ مچ شہزادہ ہوں۔" اس نے دِل میں کہا۔ "میرا باپ ضرور کوئی بادشاہ ہے۔ میں اُسے تلاش کروں گا، چاہے وُہ دنیا کے کسی کونے میں ہو۔" اس نے آڑے وقتوں کے لئے کچھ روپے بچا کر رکھے تھے۔ وہ جیب میں ڈالے اور راتوں رات اسکندریہ سے رُخصت ہو گیا۔

وہ جس بستی سے گزرتا لوگ تعجب کرتے۔ سوچتے اتنا بڑا آدمی اور پیدل جارہا ہے۔ سعُود تاڑ گیا کہ لوگ اسے دیکھ کر حیرت کیوں کر رہے ہیں۔ اس نے اگلے گاؤں میں پہنچ کر ایک مریل سا گھوڑا خریدا اور اس پر سوار ہو کر آگے چل دیا۔

تھوڑی دور ہی گیا ہو گا کہ ایک گھڑ سوار ملا۔ بیس بائیس برس کی عمر، چندے آفتاب، چندے ماہتاب۔ اس نے سعُود کو بتایا کہ میرا نام عُمر ہے اور میں مصر کے ایک پاشا یوسف کا بھتیجا ہوں۔" سعُود نے بھی اُسے کُچھ ایسی ہی باتیں بتائیں اور دونوں بہت جلد گہرے دوست بن گئے۔

شام کو وہ ایک سرائے میں ٹھہر گئے۔ کھانا کھا کر سونے لیٹے تو عُمر نے ایک عجیب بات بتائی اُس نے کہا۔ ''یوسف پاشا کا اِنتقال ہو چکا ہے۔ مرتے وقت اُس نے مُجھے بتایا تھا کہ تُم میرے بھتیجے نہیں، ایک بادشاہ کے بیٹے ہو۔ تمہارے پیدا ہونے سے پہلے نجومیوں نے بادشاہ کو ہدایت کی تھی کہ اپنے بچّے کو اس وقت تک نہ دیکھنا کہ جب تک کہ وہ بائیس برس کا نہ ہو جائے۔ اگر اِس سے پہلے تُم نے اسے دیکھ لیا تو وہ مر جائے گا۔''

بادشاہ کو دُکھ تو بہت ہوا، مگر کرتا بھی کیا! یوسف پاشا اُس کا بچپن کا دوست تھا۔ اس نے پیدا ہوتے ہی مُجھے پاشا کے پاس بھیج دیا۔ اور اُسی نے مجھے پال پوس کر جوان کیا۔ پاشا نے مجھے میرے باپ کا نام کبھی نہیں بتایا۔ البتّہ اُس نے مرنے سے پہلے یہ کہا تھا کہ تُم اس سال رمضان کی چار تاریخ کو پورے بائیس سال کے ہو جاؤ گے۔ اس دِن تُم ''السّراج'' کے مقام پر جانا جو اسکندریہ سے چار دِن کی دوری پر ہے۔ وہاں کے لوگ تمہارا انتظار کر رہے ہوں گے۔ اُنہیں تم یہ خنجر دِکھانا اور کہنا میں ہی وُہ شخص ہوں جس کی آپ کو تلاش ہے۔ وہ لوگ تمہیں

بادشاہ کے پاس لے جائیں گے۔"

"وہ خنجر کہاں ہے؟" سعُود نے جلدی سے پُوچھا۔

"یہ رہا میری پیٹی میں۔" عُمر نے اُسے خنجر دکھایا۔

یہ عجیب و غریب کہانی سُن کر سعُود کے دِل میں حسد کی آگ بھڑک اُٹھی۔ اُس نے سوچا "کاش! میں اس کی جگہ ہوتا۔ اب یہ تو کچھ دِن بعد ایک سلطنت کا وارث بن جائے گا اور میں یونہی جوتیاں چٹخاتا پھروں گا۔" اُس نے عُمر کی طرف دیکھا جو بے خبر پڑا سو رہا تھا۔ یکایک اُس کے دِل میں ایک خطرناک خیال آیا۔ وہ چُپکے سے اُٹھا، عُمر کی پیٹی سے خنجر نکالا اور اُس کے گھوڑے پر سوار ہو کر ہَوا ہو گیا۔ اُس دِن رمضان کی پہلی تاریخ تھی اور سعُود کو چار تاریخ تک "السّراج" پہنچنا تھا۔ لیکن وُہ عُمر کے تیز رفتار گھوڑے پر دو ہی دِن میں پُہنچ گیا۔ یہاں چاروں طرف چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں اور درمیان میں ایک میدان تھا جس میں کہیں کہیں اِکّادُکّا کھجور کے درخت کھڑے تھے۔ اُس نے ایک درخت کے نیچے گھوڑا باندھا اور پیر پسار کر سو گیا۔

دوسرے دن، دوپہر کے وقت گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز آئی۔ سعُود ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ کچھ دیر بعد دس بارہ گھڑ سوار میدان میں آئے اور ایک درخت کے پاس ٹھہر گئے۔ اُن میں ایک اَدھیڑ عُمر کا آدمی بھی تھا جس کی پگڑی میں ایک بہت بڑا لعل جگمگا رہا تھا۔ وُہ سب سے آگے تھا اور باقی لوگ اُس کے پیچھے اَدب سے ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ سعُود نے سوچا یہی بادشاہ ہے۔ وُہ دوڑتا ہوا اُس کے قرب گیا، جھُک کر تین دفعہ سلام کیا اور بولا۔ ”میں ہی وہ شخص ہوں، جس کی آپ کو تلاش ہے۔ یہ میرا خنجر ہے۔“

بادشاہ نے خنجر دیکھا اور پھر دونوں ہاتھ پھیلا کر سعُود کو اپنے سینے سے چمٹا لیا۔ عین اُسی وقت کِسی شخص کی دُور سے آواز آئی۔ ”ٹھہرو! ٹھہرو!“ سعُود نے سر اُٹھا کر دیکھا تو اُس کے پیروں تلے سے زمین نِکل گئی۔ عُمر اُس کے مریل گھوڑے پر سوار اُن کی طرف آ رہا تھا۔

”یہ شخص مکّار ہے، دھوکے باز ہے۔“ وہ چیخ کر بولا۔ ”اصلی شہزادہ میں ہوں۔۔۔“

لوگ حیرت سے آنکھیں پھاڑے کبھی عُمر کو دیکھتے اور کبھی سعُود کو۔ آخر اُن کی نگاہیں بادشاہ کے چہرے پر جم گئیں کہ دیکھیں وُہ کیا فیصلہ کرتا ہے۔

بادشاہ نے غصّے سے ہونٹ کاٹا اور کڑک کر بولا۔ ”یہ نوجوان پاگل معلُوم ہوتا ہے۔ اِسے گھوڑے کی پیٹھ سے باندھ دو۔ ہم اسے اپنے ساتھ لے جائیں گے اور ایسی سزادیں گے کہ آسمان بھی کانپ اُٹھے گا۔“

حکم کی دیر تھی۔ مصاحبوں نے عُمر کی مُشکیں کس لیں اور گھوڑے کی پیٹھ پر اوندھا لٹا کر رسیوں سے باندھ دیا۔

دو دن اور دو راتوں کے سفر کے بعد بادشاہ اپنے ملک کی حد میں داخل ہوا۔ سعُود بڑی شان سے گھوڑے پر بیٹھا بادشاہ کے پہلو میں چل رہا تھا اور عُمر گھوڑے سے بندھا پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ تمام گاؤں، قصبے اور شہر دُلہن کی طرح سجائے گئے تھے۔ گلی کوچوں میں جھنڈیاں لگی تھیں اور چوکوں میں خوب صورت دروازے لگے تھے۔ شاہی جلوس جِدھر سے گزرتا، لوگ اُس کی راہ میں آنکھیں بِچھاتے۔

شاہی محل میں مامتا کی ماری ماں اپنے پیارے بیٹے کا انتظار کر رہی تھی۔ اُس کا دِل

دھک دھک کر رہا تھا اور آنکھوں سے خوشی کے آنسو رواں تھے۔ شاہی جلُوس محل میں داخل ہوا تو نقّارچیوں نے نقّارے بجا بجا کر آمد کا اعلان کیا۔ ملکہ مارے خوشی کے ننگے سر، ننگے پیر، دوڑی دوڑی آئی اور بے اختیار سعُود کو گلے لگا لیا مگر پھر ایکا ایکی پیچھے ہٹی اور بولی۔ ”نہیں، نہیں۔ ماں کی ممتا کہہ رہی ہے کہ یہ تیرا بچّہ نہیں ہے“!

”آپ کیا فرما رہی ہیں ملکۂ عالیہ؟“ بادشاہ نے حیرت سے کہا۔ ”یہی آپ کا بیٹا ہے۔ اسے سینے سے لگا کر کلیجا ٹھنڈا کیجیے۔۔۔۔“

”نہیں۔ نہیں۔“ ملکہ دونوں ہاتھ ہلاتی ہوئی پیچھے ہٹی۔ عین اُسی وقت دروازہ کھلا، عُمر دربانوں کو دھکّے دیتا ہوا اندر آیا اور بادشاہ کے قدموں میں سر رکھ کر بولا۔ ”مُجھے اپنے ہاتھ سے قتل کر دیجیے۔ میں اب زیادہ برداشت نہیں کر سکتا۔“

بادشاہ کا چہرہ غصّے سے سُرخ ہو گیا۔ اُس نے کہا۔ ”اس پاگل کو کِس نے چھوڑ دیا ہے؟ پکڑ لو اِسے اور زنجیروں میں جکڑ کر کال کوٹھڑی میں بند کر دو۔ کل صُبح ہم اِس کی قسمت کا فیصلہ کریں گے۔“

”ٹھہریے!“ ملکہ آگے بڑھ کر بولی۔ ”میں نے اِس نوجوان کو پہلی دفعہ دیکھا ہے مگر پتا نہیں کیوں میرا دِل اس کی طرف کھِچا جارہا ہے۔ میری ممتا کہہ رہی ہے کہ یہی میرا بیٹا ہے۔“

”یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟“ بادشاہ نے کہا۔ ”میں تمام باتیں اپنی آنکھوں سے دیکھ چُکا ہوں۔ السّراج کے مقام پر یہی نوجوان آ کر مِلا تھا۔ اور مُجھے وُہ نشانی دکھائی تھی جو میں نے یوسف پاشا کو دی تھی۔“

”جب میں سو رہا تھا تو اس دھوکے باز نے وہ خنجر چُرا لیا تھا۔“ عُمر نے کہا۔

”یہ غلط ہے، عالی جاہ!“ سعُود بولا۔ ”یہ شخص اسکندریہ کا ایک معمولی سا درزی ہے اور آپ کا بیٹا بن کر تاج و تخت پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔“

”اوہ۔۔۔!“ بادشاہ سر پکڑ کر بولا۔ ”سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں“!

”حضور! یوسف پاشا ہی سے کیوں نہیں معلوم کر لیتے؟“ ملکہ نے کہا۔

”وہ مر چکا ہے۔“ بادشاہ نے جواب دیا۔

"ہمیں جلد بازی نہیں کرنی چاہیے۔" ملکہ نے بولی۔ "میرا دِل کہہ رہا ہے کہ یہ نوجوان ہی میرا بیٹا ہے، پھر بھی میں چاہتی ہوں کہ اِس بات کا آپ کو پورا پورا ثبوت مہیّا کروں۔ حضور! مجھے تین دن کی مہلت دیں۔ انشاء اللہ میں دُودھ کا دُودھ اور پانی کا پانی کر دکھاؤں گی۔"

ملکہ نے زنان خانے میں آ کر اپنی تمام لونڈیوں اور باندیوں سے مشورہ کیا۔ کسی نے کُچھ رائے دی تو کسی نے کُچھ۔ ملکہ کی ایک مُنہ چڑھی باندی، مہ لقا بہت عقل مند اور ہوشیار تھی۔ اُس نے ہاتھ باندھ کر کہا:

"ملکہ عالیہ! اجازت دیں تو بندی کُچھ عرض کرے۔"

"اجازت ہے۔۔۔" ملکہ نے کہا۔

"حضور! ان نوجوانوں کی گفتگو سے میں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اِن میں سے ایک شہزادہ ہے اور دوسرا درزی۔"

"لیکن ہم یہ کیسے ثابت کریں گے؟"

”میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی ہے، تنہائی میں عرض کروں گی۔“

”تخلیہ۔۔۔!“ ملکہ نے تالی بجا کر کہا۔ لونڈیوں اور باندیوں نے جھک کر تین دفعہ سلام کیا اور اُلٹے قدموں باہر نِکل گئیں۔

”اب کہو۔ وُہ کیا ترکیب ہے؟“ ملکہ نے بڑے شوق سے پوچھا۔ مہ لقا نے ملکہ کے کان سے مُنہ لگا دیا اور بُہت دیر تک دونوں کھُسر پھُسر کرتی رہیں۔ تیسرے دن شام کو بادشاہ نے دربار لگایا۔ دونوں نوجوان اُس کے سامنے پیش کیے گئے۔

”ملکۂ عالیہ ثابت کریں کہ اِن میں سے کون سچّا ہے اور کون جھُوٹا۔۔۔!“ بادشاہ نے کہا۔

”عالی جاہ۔۔۔!“ ملکہ بولی۔ ”اِن دونوں کو کپڑا قینچی اور سوئی دھاگا دے کر الگ الگ بند کر دیا جائے۔ یہ دو دن کے اندر اندر ایک خوبصورت سی پُوشاک سئیں گے۔ جس پوشاک کی کاٹ اور سلائی بے عیب ہو گی، وہی شہزادہ ہو گا۔“

امتحان کُچھ عجیب سا تھا۔ بادشاہ پہلے تو ہچکچایا مگر پھر راضی ہو گیا۔ دونوں نوجوانوں

کو کپڑا، قینچی اور سوئی دھاگا دے کر الگ الگ بند کر دیا گیا۔

دو دن بعد پھر دربار لگا۔ تمام وزیر اور امیر جمع ہوئے۔ سعُود کی آنکھیں خُوشی سے چمک رہی تھیں مگر عُمر کا مُنہ لٹکا ہوا تھا۔ سعُود نے آگے بڑھ کر پہلے اپنی پوشاک پیش کی۔

بادشاہ خُوشی سے اُچھل پڑا اور بولا۔ ”واہ وا! سبحان اللہ! کِس اُستادی سے سی ہے! کمال کی حد کر دی! ہمارے شاہی درزی بھی اِتنی خُوب صُورت اور بے عیب پوشاک نہیں سی سکتے۔“

ملکہ نے مُسکرا کر عُمر کی طرف دیکھا اور بڑی محبّت سے بولی۔ ”نوجوان! اب تُم اپنا کارنامہ دکھاؤ۔“

عُمر نے بِن سلا کپڑا فرش پر پٹخ دیا اور بولا۔ ”حضُور! یُوسف پاشا نے مُجھے شہ سواری سکھائی تھی۔ میں نے تلوار اور تیر چلنا سیکھا تھا۔ مُجھے معلوم نہیں کہ کپڑا کیسے کاٹتے ہیں اور پوشاک کِس طرح سی جاتی ہے“!

ملکہ جلدی سے اُٹھی اور عُمر سے لپٹ گئی۔ "تو میرا بیٹا ہے۔۔۔۔ تُو ہی میرا بیٹا ہے۔ جہاں پناہ! اب بھی آپ نہیں سمجھے کہ شہزادہ کون ہے اور درزی کون؟"

"او دھوکے باز! فریبی لڑکے!" بادشاہ نے سعُود سے کہا۔ "سچ سچ بتا تُو کون ہے اور یہ سوانگ کیوں رچایا؟ ورنہ یاد رکھ ابھی تیرے سارے بَخیے اُدھیڑ دوں گا۔"

سعُود کا مُنہ فق ہو گیا۔ بدن تھر تھر کانپنے لگا۔ وُہ اوندھے مُنہ فرش پر گر پڑا اور بولا۔ "عالی جاہ! مُجھے معاف کر دیں۔ میں ایک بدنصیب درزی ہوں۔ آپ کا حقیقی بیٹا عُمر ہے۔ لالچ نے مُجھے اندھا کر دیا تھا۔"

"ہر گز نہیں۔" بادشاہ نے کہا۔ "سپاہیو! پکڑ لو اس پر بدمعاش کو اور محل کے بُرج سے نیچے پھینک دو۔۔۔"!

"اِسے معاف کر دیجیے ابّا حضور!" عُمر بولا۔ "لالچ واقعی انسان کو اندھا کر دیتا ہے اور وُہ نیکی بدی میں تمیز نہیں کر سکتا۔ مُجھے اُمّید ہے کہ یہ آیندہ ایمان داری کی زندگی بسر کرے گا۔"

”اچھا! تُم کہتے ہو تو ہم معاف کرتے ہیں۔ جا لڑکے! ہماری نظروں سے دُور ہو جا۔۔۔“

”حضور! لڑکا بڑا اچھّا کاریگر ہے۔“ ملکہ نے کہا۔ ”ہم سفارش کرتے ہیں کہ اسے شاہی درزیوں میں شامل کر لیا جائے۔“

ہم اپنی پیاری ملکہ کی سفارش منظور کرتے ہیں۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”آج سے یہ شاہی درزی ہے لیکن ہم نے اپنے درزیوں کو قِسم قِسم کے خطاب دے رکھتے ہیں۔ اِسے کیا خطاب دیا جائے؟“

”شہزادہ۔۔۔“ ملکہ نے کہا اور بادشاہ قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

کوٹ

محسن ہاشمی

حامد کو کوٹ کی سخت ضرورت تھی۔ ایک تو اس لیے کہ اُسے بھی دوسرے لوگوں کی طرح سردی لگتی تھی۔ اور دوسرے اس لیے کہ مدرسے میں اس کی جماعت کے سب لڑکوں نے کوٹ پہن رکھّے تھے۔ بعض لڑکے اُس کے کوٹ نہ پہننے پر اُس کا مذاق بھی اڑاتے تھے۔ اُس کی امّی نے اُسے پرانے کپڑے اور روئی

سے ایک صدری بنادی تھی جو وُہ قمیص کے نیچے پہنے رہتا تھا۔ مگر اُس سے سردی کا پورے طور پر بچاؤ نہیں ہوتا تھا۔ اب یہ بات تو نہیں تھی کہ حامد کے ابّا اُس سے پیار نہیں کرتے تھے اس لیے اُسے کوٹ بنوا کر نہیں دیتے تھے۔ وُہ تو حامد کو بڑا چاہتے تھے مگر مُصیبت یہ تھی کہ اُن کے پاس حامد کو کوٹ سلوا کر دینے کے لیے پیسے نہیں ہوتے تھے۔ اُن کی تنخواہ بہت تھوڑی تھی اور گھر میں چھ آدمی کھانے والے تھے۔ حامد، حامد کے دو بہن بھائی، ابّا، امّی اور دادی امّاں۔ بڑی مُشکل سے گزارا ہوتا تھا۔

ستمبر کے آخر میں جب سردی شروع ہوئی تو حامد کی امّی نے اُس کے ابّا سے کہا "میں نے کہا بازار میں پُرانے کوٹ بِک رہے ہیں۔ سردی کا موسم آ گیا ہے۔ آپ پانچ چھ روپے کا کوٹ حامد کے لیے بھی لے آئیں۔" حامد کے ابّا بولے۔ "اس مہینے تو پیسے نہیں بچیں گے۔ اگلے مہینے حامد کو نیا کوٹ سلوا دوں گا۔ میرا بیٹا پُرانا کوٹ کیوں پہنے!" وُہ اپنے لڑکے کو پُرانا کوٹ نہیں پہنانا چاہتے تھے۔ اگرچہ جو کوٹ اُنہوں نے دس روپے میں پُرانے کوٹوں کی ایک دکان سے خریدا تھا اُس

کا رنگ اور کپڑا اِتنا خراب ہو گیا تھا کہ اب اُسے کوٹ کہنا بھی زیادتی تھی۔

اکتوبر کا مہینا گُزر گیا اور نومبر کی پہلی تاریخ آ گئی، مگر کوٹ پھر بھی نہ سِل سکا، اس لیے کہ جو تھوڑے سے پیسے بچے نے اُن سے ایک رضائی بنوا لی گئی جو کوٹ سے بھی زیادہ ضروری تھی۔ اب حامد کے ابّا نے نیا کوٹ سلوانے کا ارادہ بدل دیا۔ اُنھوں نے سوچا، بہت سے لوگ پُرانے کوٹ پہنتے ہیں۔ حامد پہن لے گا تو کیا ہو جائے گا۔ اُنھوں نے حامد کی امّی سے کہا کہ وُہ دسمبر کی پہلی تاریخ کو حامد کو ایک پُرانا کوٹ ہی خرید دیں گے۔ مگر جب دسمبر کی پہلی تاریخ آئی تو حامد کی چھوٹی بہن ننھّی اور چھوٹا بھائی گڈّو دونوں سخت بیمار تھے۔ ان کی دوائیوں اور دودھ پر بڑے پیسے خرچ ہوتے تھے۔ اس لیے حامد کے ابّا کے پاس پیسے نہ بچے۔ بے چارہ حامد صدری پہن کر ہی گزارا کرتا رہا۔ اُسے سردی بھی لگتی تھی اور اسکول میں خالی قمیص پہن کر جاتے ہوئے شرم سے بھی محسوس ہوتی تھی۔ مگر اُس نے اپنے ابّا جان سے کبھی کوٹ کے لیے نہ کہا۔ اُسے معلُوم تھا کہ ابّا جان کے پاس پیسے نہیں ہیں۔ ایک دن اسکول میں اُسے اس کے ہم جماعتوں نے بڑا تنگ کیا۔ ایک

لڑکا کہنے لگا "حامد کا باپ ظالم ہے۔ اِتنی سردی ہے مگر وہ اُسے کوٹ لے کر نہیں دیتا۔" حامد چُپ رہا۔ دوسرا لڑکا بولا۔ "میرے ابّا نے تو مُجھے دو کوٹ سلا کر دیے ہیں اور پچھلے سال کے کوٹ میں سے پھینک دیے ہیں۔" پھر وُہ حامد سے کہنے لگا۔ "تم ہمارے گھر آنا اور میرا پُرانا کوٹ لے آنا۔"

حامد نے کہا۔ "مُجھے کوٹ کی ضرورت نہیں۔ مُجھے سردی نہیں لگتی۔"

سب لڑکے ہنسنے لگے۔ ایک بولا۔ "بڑے پہلوان ہو نا تُم۔ سردی نہیں لگتی۔" اُس نے حامد کی نقل اُتاری۔

حامد کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وُہ وہاں سے چلا گیا۔ اُس دِن شام کو گھر آ کر اُس نے ابّا سے کہا۔ "ابّا! مَیں اب اسکول نہیں جاؤں گا۔ میں کِسی کارخانے میں کام کروں گا۔" اُس کے ابّا بڑے حیران ہوئے، کیونکہ حامد کو پڑھائی کا بڑا شوق تھا اور امتحان میں ہمیشہ اوّل آتا تھا۔ اُنہوں نے حامد کو تعلیم کے فائدے بتائے اور سمجھایا کہ تعلیم کے بغیر وُہ بڑا آدمی کیسے بنے گا؟

حامد نے کُچھ سوچ کر کہا۔ "ابّا! پڑھنے سے کُچھ نہیں ہوتا۔ آپ بھی تو اتنا پڑھے

ہوئے ہیں۔"

حامد کے ابّا بیٹے کی یہ بات سُن کر چُپ ہو گئے۔ پھر اُنہوں نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "بیٹا! یہ ضروری تو نہیں کہ تمہاری قسمت بھی میری طرح ہو۔ تُم ان باتوں کو نہ سوچا کرو۔ اور خوب دِل لگا کر پڑھو۔"

مہینے کا بھی اور سال کا بھی آخری دِن تھا۔ حامد کے ابّا کام سے واپس آ رہے تھے۔ راستے میں انہوں نے دیکھا کہ حامد اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ گھر جا رہا ہے۔ اُس کے ساتھیوں نے بڑے اچھّے اچھّے کوٹ پہنے ہوئے تھے مگر حامد قمیص پہنے سردی سے ٹھٹھرتا ہوا جا رہا تھا۔ ان کا دِل بھر آیا۔ اُنہوں نے حامد کو آواز دی اور اُسی وقت اُسے پُرانے کوٹوں کی دُکان پر لے گئے۔ وہاں اُنہوں نے ایک کوٹ پسند کیا۔ حامد نے پہن کر دیکھا۔ کوٹ اُس کے جسم پر بالکل ٹھیک تھا اور اُسے بڑا اچھّا لگ رہا تھا۔ اُس نے خُوشی خُوشی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اور بڑے شیشے میں دیکھا۔ وُہ خُود کو کوٹ پہنے ہوئے دیکھ کر بڑا خوش تھا۔ سعادت صاحب نے کوٹ اُتروا کر ایک طرف رکھ دیا اور دُکان دار سے قیمت پوچھی۔ دُکان دار

اُنہیں جانتا تھا۔ کہنے لگا۔ ''سعادت صاحب! یہ کوٹ تو دس روپے میں بھی سستا ہے۔ مگر آپ سے میں صرف پانچ روپے لوں گا۔'' سعادت صاحب نے اِطمینان کا سانس لیا۔ اُنہوں نے بڑی مُشکل سے گھر کے خرچ کا حساب لگا کر پانچ روپے ہی بچائے تھے۔ انہوں نے دُکان دار سے کہا۔ ''بھائی صاحب! یہ کوٹ ہمارا ہو گیا۔ آپ اسے کل تک ایک طرف رکھ دیں۔ کل یہ بچّہ آئے گا اور پیسے دے کر لے جائے گا۔

گھر آ کر سعادت صاحب نے حامد کی امّی کو بھی بتا دیا کہ وہ کوٹ پسند کر آئے ہیں۔ دوسرے دِن تنخواہ لے کر سعادت صاحب گھر آئے اور آتے ہی حامد کو بُلایا۔ ''حامد بیٹا! یہ لو اپنے پانچ روپے اور کوٹ لے آؤ۔'' اس کے بعد وُہ اور حامد کی امّی باقی پیسوں کا حساب کرنے لگے۔ حامد کی امّی نے کہا۔۔۔ ''میرا دوپٹّا بھی بالکل پھٹ گیا ہے مگر بچّے کا کوٹ آ جائے، دوپٹّا میں اگلے ماہ لے لوں گی۔''

حامد پانچ روپے کا نوٹ لے کر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ واپس آیا تو اُس نے کوٹ نہیں پہنا ہوا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک لفانہ تھا۔ اُس نے اپنی امّی کی گود

میں ڈال دیا۔ امّی نے حیران ہو کر اُسے کھولا۔ اُس میں دوپٹّا تھا۔ امّی نے کہا۔ ”یہ کیا حامد! کوٹ کیوں نہیں لائے؟“ حامد بولا۔ ”امّی! آپ کے پاس دوپٹّا جو نہیں تھا۔ میں کوٹ پھر لے لوں گا۔“ حامد کی امّی نے اُسے گلے سے لگالیا۔

پمپیائی کا کُتّا

مقبول جہانگیر

آج سے دو ہزار سال پہلے پمپیائی سلطنت روم کا ایک نہایت خوبصورت شہر تھا۔ اس شہر کے باہر ایک آتش فشاں پہاڑ تھا جسے ویسوَیس کہتے تھے۔ پمپیائی کے باشندے بڑے عیّاش اور بدکار لوگ تھے۔ اُن میں نیکی اور خُدا ترسی نام کو یہ تھی۔ طاقت ور کمزوروں کو بے گناہ مار ڈالتے۔ ساہوکار اور مال دار غریبوں کا

خون چُوستے اور اس طرح اُنہوں نے اپنے گھروں میں بے شمار سونا چاندی جمع کر لیا تھا۔ جس سے وُہ دِن رات رنگ رلیاں مناتے تھے۔

آخر جب ان لوگوں کے گناہ حد سے زیادہ ہو گئے تو اُن پر خُدا کا عذاب نازل ہوا۔ ایک روز آتش فشاں پہاڑ پھٹ گیا اور اُس میں سے پھگلتا ہُوا سُرخ لاوا پانی کی طرح بہہ نِکلا۔ پمپیائی پر آگ کے شُعلوں کی بارش ہوئی اور سارا شہر ایک خوف ناک زلزلے سے تھوڑی ہی دیر میں خاک کا ڈھیر بن کر رہ گیا۔ یہ کہانی جو ہم تُمھیں سُنا رہے ہیں اِسی پمپیائی سے تعلّق رکھتی ہے۔

ٹیٹو اور اُس کا کُتّا بمبو، شہر کی فصیل کے باہر رہا کرتے تھے۔ قریب ہی بڑا دروازہ تھا، جس کے راستے باہر کے لوگ شہر میں جاتے تھے۔ ٹیٹو اور بمبو یہاں سونے کے لیے آتے تھے۔ اُن کا یہاں گھر نہ تھا۔۔ اُن کا گھر تو کہیں بھی نہ تھا۔ وہ جہاں چاہتے، چلے جاتے اور جِس جگہ جی چاہتا سو جاتے۔ شہر میں ہر وقت دھما چوکڑی مچی رہتی تھی۔ میدانوں میں مختلف کھیل تماشے ہوتے رہتے۔ اسٹیڈیم میں جنگی کھیل دکھائے جاتے۔ غلاموں کی آپس میں لڑائیاں کرائی جاتیں اور

کبھی کبھی بھُوکے شیروں سے بھی لڑوایا جاتا۔

سال میں ایک مرتبہ روم کا بادشاہ پمپیائی آیا کرتا تھا۔ اس کی آمد پر شہر میں کئی روز تک خوشیاں منائی جاتیں اور خوب جشن ہوتے لیکن بے چارہ ٹیٹو ان کھیل تماشوں کو نہیں دیکھ سکتا تھا وُہ اندھا تھا۔ شہر کے کِسی باسی کو معلُوم نہ تھا کہ اُس کے ماں باپ کون تھے؟ اس کی عُمر کیا ہے اور کہاں سے آیا ہے۔ اس بھری دنیا میں اُس کا ہمدرد اور غم خوار صرف بمبو تھا اور وُہ ہمیشہ اُس کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ لیکن دن میں تین مرتبہ ایسا ہوتا کہ وہ اپنے دوست کو کسی محفوظ جگہ چھوڑ کر چلا جاتا اور تھوڑی دیر بعد منہ میں روٹی یا گوشت کا ٹکڑا دبائے واپس آجاتا۔ پھر دونوں مِل بانٹ کر کھالیتے اور خُدا کا شُکر ادا کرتے۔

کُتّے کی بدولت ٹیٹو کو دِن میں تین وقت کھانا مِل جایا کرتا تھا اور کبھی فاقے کی نوبت نہیں آئی تھی لیکن اِس کے باوجود وہ ہر وقت اُداس سا رہتا تھا۔ وُہ پمپیائی کی گلیوں میں بچّوں کو بھاگتے دوڑتے ہوئے سُنتا، کبھی وہ آنکھ مچولی کھیلتے اور کبھی چور اور بادشاہ کا کھیل۔ اُن کے اُچھلنے کُودنے کی آوازیں ٹیٹو کے کانوں

میں پہنچتیں تو اُس کا دل چاہتا کہ وہ بھی اُن کے ساتھ کھیلے لیکن وہ ایسا نہ کر سکتا تھا۔ وہ تو ایک بے سہارا، غریب اور اندھا لڑکا تھا اور سوائے ایک کُتّے کے اُس کا کوئی دوست نہ تھا۔ خُدا نے اگر اُسے آنکھوں کی روشنی سے محروم کر دیا تھا لیکن سُننے، سُونگھنے اور چھُو کر محسوس کرنے کی قوّتیں دوگنی دے دی تھیں۔ وہ انہی قوّتوں کی بدولت ان چھوٹی چھوٹی باتوں سے بھی واقف ہو جاتا جو دوسرے لوگ آنکھیں رکھنے کے باوجود معلُوم نہ کر سکتے تھے۔ جب دونوں دوست شہر کی سَیر کے لیے نکلتے تو ٹیٹو اِرد گرد کی آوازیں سُن کر صحیح اندازہ لگا سکتا تھا کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔

پمپیائی کی اکثر عمارتیں بالکل نئی تھیں کیونکہ بارہ سال پہلے یہاں ایک زلزلہ آیا تھا جس سے بُہت سی عمارتیں گِر گئی تھیں۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد لوگوں نے سارا شہر گِرا کر اُسے دوبارہ تعمیر کیا جو پہلے سے بھی زیادہ خوب صورت شہر بن گیا اور نیپلز اور روم جیسے عالی شان شہروں کا مقابلہ کرنے لگا۔

پمپیائی کے کِسی باشندے کو معلُوم نہ تھا کہ زلزلہ کیوں آتا ہے۔ ملّاح کہا کرتے

تھے کہ زلزلہ آنے کا سبب یہ ہے کہ شہر کے لوگ ملّاحوں کی عزّت نہیں کرتے۔ ملّاح سمندر پار سے اُن کے لیے کھانے پینے کی چیزیں لاتے ہیں اور سمندری ڈاکوؤں سے بھی اُن کو محفوظ رکھتے ہیں۔ مندروں کے پُجاری کہا کرتے تھے کہ زلزلہ آنے کی وجہ آسمانی دیوتاؤں کی ناراضگی ہے کیونکہ لوگوں نے عیش و عشرت میں پڑ کر عبادت کرنی چھوڑ دی ہے اور وہ دیوتاؤں کے لیے قربانیاں بھی نہیں کرتے۔

شہر کے تاجر کہتے تھے کہ باہر سے آنے والے تاجروں کی بے ایمانیوں نے شہر کی زمین کو ناپاک کر دیا ہے اور اِسی لعنت کی وجہ سے زلزلہ آتا ہے۔ غرض، جتنے مُنہ، اتنی باتیں۔ ہر شخص اپنی بات زور زور سے کہتا اور اُسے منوانے کی بھی کوشش کرتا۔

اُس روز بھی دوپہر کو جب ٹیٹو اور بمبو بڑے چوک میں سے گُزر رہے تھے، شہر کے لوگ اِسی قِسم کی باتیں کر رہے تھے۔ چوک لوگوں سے کھچّا کھچ بھرُا ہوا تھا اور کان پڑی آواز سُنائی نہ دیتی تھی۔ لیکن ٹیٹو کے کان بڑے تیز تھے۔ ایک جگہ

وُہ ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ دو آدمی آپس میں بحث کر رہے تھے اور اُن کے گرد بھیڑ لگی ہو تھی۔ اُن میں سے ایک کی آواز بھاری تھی اور دوسرے کی ہلکی مگر تیز۔ بھاری آواز والا کہہ رہا تھا "میں کہتا ہوں اب یہاں کوئی زلزلہ نہیں آئے گا۔ تُم نے سُنا نہیں کہ آسمانی بجلی کی طرح زلزلہ بھی جہاں ایک بار آجائے، دوبارہ نہیں آیا کرتا۔"

"تمہارا خیال غلط ہے۔" ہلکی آواز والے نے کہا۔ "تمہیں معلُوم نہیں کہ پندرہ برس کے اندر سسلی میں دو مرتبہ زلزلہ آیا تھا؟ بھلا بتاؤ تو ویسوَیس پہاڑ دھواں کیوں اُگلتا رہتا ہے؟ کیا اس کا کوئی مطلب نہیں؟"

یہ سُن کر بھاری آواز والا آدمی قہقہہ مار کر ہنس پڑا اور بولا۔ "ارے بھائی! یہ دھواں تو ہمیشہ سے نکلتا ہے اور سچ پُوچھو تو یہ دھواں ہمارے لیے ہے بھی بڑا مفید۔ ہم اس سے موسم اور ہوا کا رُخ پہچان لیتے ہیں۔ اگر دھواں سیدھا آسمان کی طرف جائے تو ہم سمجھ لیتے ہیں کہ موسم صاف رہے گا اور جب اِدھر اُدھر پھیلنے لگے تو اِس مطلب ہوتا ہے کہ آج کُہر پڑے گی۔ اگر دھواں مشرق کی

طرف۔۔۔"

"اچھّا۔ اچھّا۔ بس کرو۔ میں سمجھ گیا جو تُم کہنا چاہتے ہو۔" ہلکی آواز والے نے بات کاٹ کر کہا۔ "ہمارے یہاں ایک کہاوت مشہور ہے کہ جو لوگ انسان کی نصیحت پر عمل نہیں کرتے انُہیں دیوتا سبق دیتے ہیں۔ اس سے زیادہ میں کُچھ نہیں کہُوں گا لیکن میں تُمہیں ایک تنبیہہ ضرور کرتا ہوں کہ جب آتش فشاں پہاڑ کا دھواں آسمان پر گھنے درخت کی صورت اِختیار کر لے تو اُس وقت تُم لوگ اپنی جان بچانے کی فکر کرنا! یہ کہہ کر وُہ چلا گیا۔

ٹیٹو اُن کی یہ گفتگو سُن کر بہُت حیران ہوا۔ بمبو کُتّے کا بھی یہی حال تھا۔ وہ اپنی گردن، ایک طرف جھکائے کُچھ سوچ رہا تھا۔ لیکن رات ہوتے ہوتے لوگ یہ باتیں بھول بھال گئے اور اس جشن میں شامل ہو گئے جو روم کے بادشاہ سیزر کی سالگرہ کی خوشی میں منایا جارہا تھا۔

دوسرے دِن صُبح کو بمبو ایک بیکری سے دو میٹھے کیک چُرا کر لایا۔ ٹیٹو ابھی تک سو رہا تھا۔ بمبو کے زور زور سے بھونک کر اُسے جگایا۔ ٹیٹو نے ناشتا کیا اور پھر سو گیا،

کیونکہ رات کو بُہت دیر سے سویا تھا۔ کُچھ ہی دیر بعد بمبو نے اُسے پھر اُٹھا دیا۔ ٹیٹو
نے اُٹھ کر جمائی لی تو ایسا لگا جیسے فضا بہت گرم ہے۔ اُسے ایک گہری دُھند چاروں
طرف پھیلتی ہوئی محسوس ہوئی جو سانس کے ذریعے اُس کے پھیپھڑوں میں جا
رہی تھی۔ وُہ کھانسنے لگا اور سمندر کی ٹھنڈی ہوا میں سانس لینے کے لیے وہاں سے
اُٹھا لیکن تھوڑی ہی دُور جا کر اُسے محسوس ہوا کہ ہوا بے حد گرم اور زہریلی ہے۔
اُس کی ناک میں عجیب سی بُو آ رہی تھی۔ بمبو اُس کی قمیص پکڑ کر کھینچ رہا تھا۔ ایسا
معلُوم ہوتا تھا جیسے وہ اُسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔ لیکن کہاں؟ ٹیٹو یہ نہ
سمجھ سکا۔ گرم ہَوا کے جھُونکے بار بار اُس کے چہرے سے ٹکراتے تھے۔ اُس نے
محسوس کیا کہ یہ ہوا نہیں بلکہ گرم راکھ ہے جو بارش کی طرح چاروں طرف برس
رہی ہے۔ یہ راکھ اتنی گرم تھی کہ ٹیٹو کے بدن کی کھال جلی جا رہی تھی۔

اچانک اُس کے کانوں میں عجیب طرح کی ڈراؤنی آوازیں آنے لگیں۔ جیسے ہزارہا
وحشی درندے زمین کے نیچے دبے ہوئے چلّا رہے ہوں۔ پھر بہت سے لوگوں
کے رونے اور چیخنے کی آوازیں سنائی دیں۔ اب زمین درخت کے پتّے کی طرح

کانپ رہی تھی اور گرج دار آوازوں سے کلیجا بیٹھا جاتا تھا۔ وُہ دونوں بے تحاشا ایک طرف کو بھاگنے لگے۔

شہر کی طرف سے آنے والی آوازیں اور ڈراؤنی ہو گئی تھیں۔ پہاڑ گرج رہا تھا، زمین ہل رہی تھی، عمارتیں دھڑا دھڑ گر رہی تھیں اور لوگ پتھّروں کے تلے دبے چیخیں مار رہے تھے۔ جو بچ گئے تھے وہ بے تحاشا سمندر کی طرف بھاگ رہے تھے تاکہ کشتیوں میں بیٹھ کر کسی محفوظ مقام پر پہنچ جائیں۔

ٹیٹو اور بمبو بھی ایک طرف کو بھاگے جا رہے تھے۔ ٹیٹو زخموں سے نڈھال ہو چکا تھا۔ آگ کے شعلوں اور راکھ سے اُس کا سارا بدن جھلس گیا تھا۔ بمبو نے مُنہ میں اُس کی قمیص کا دامن پکڑ رکھا تھا اور اُسے اپنے ساتھ گھسٹتے لیے جا رہا تھا۔ آخر وہ اُسے لوگوں کے ہجوم سے بچاتا ایک محفوظ جگہ پر لے گیا اور یہاں وہ دونوں پتھّروں کی آڑ میں بیٹھ گئے۔

دوپہر ہو گئی۔ تکلیف، بھوک اور پیاس کے مارے ٹیٹو کا بہت بُرا حال تھا۔ اس نے بمبو کو پُکارا:

”بمبو۔۔۔بمبو۔۔۔!“ لیکن بمبو وہاں نہیں تھا۔ اِتنے میں ایک آدمی بھاگتا ہوا ٹیٹو کے پاس سے گُزرا۔ اُس نے اندھے لڑکے کو اِس حال میں دیکھا تو اُسے جھپٹ کر گود میں اُٹھالیا اور ایک کشتی میں نے جا کر بٹھا دیا۔ ملّاحوں نے پوری قوّت سے چپّو چلانے شروع کر دیے۔ ٹیٹو برابر اپنے کتّے کو آوازیں دیے جا رہا تھا۔ ”بمبو!۔۔۔ بمبو!۔۔۔ میرے دوست! تم کہاں ہو؟“ آخر روتے روتے اُس کی ہچکی بندھ گئی اور وہ نڈھال ہو کر کشتی میں لیٹ گیا۔

اٹھارہ سو سال بعد۔۔۔ سائنس دانوں کی ایک جماعت پمپیائی کا سُراغ لگانے کے لیے اس جگہ پہنچی جہاں صدیوں سے یہ شہر مٹّی کے نیچے دبا ہوا تھا۔ مزدوروں نے زمین کھودی تو اُس کے نیچے سے کھنڈر نکلے۔ سارا شہر برباد ہو چکا تھا۔ بڑے بڑے محل اور عالی شان عمارتیں خاک کا ڈھیر ہو چکی تھیں۔ بازاروں میں قیمتی چیزیں اور سونے چاندی کے زیورات بھرے پڑے تھے۔ انسانوں کے ہزاروں ڈھانچے بھی نظر آئے۔ ایک روز کھدائی کے دوران ایک عجیب چیز بر آمد ہوئی۔ یہ ایک کُتّے کا ڈھانچا تھا۔

ایک شخص حیرت سے بولا۔ ”ارے! اس کُتّے کے مُنہ میں کیا چیز ہے؟“

اور پھر غور سے دیکھا گیا تو وہ ایک روٹی کا ایک بڑا سا ٹکڑا تھا۔

سائنسدانوں نے کہا۔ ”یہاں ایک نانبائی کی دُکان تھی۔ معلُوم ہوتا ہے کہ یہ کُتا زلزلے کے وقت روٹی چُرانے نِکلا تھا مگر بے چارہ دب کر مر گیا۔“

کاش اُنہیں معلُوم ہوتا کہ بے چارہ بمبو کِس کے لیے روٹی چُرانے گیا تھا!

اجنبی دوست

عبدالرؤف ظفر

رات کا کھانا کھا کر ہم اپنے اپنے بستر پر لیٹے تو عزرا نے کہا۔ ”ابّا جان! آج کوئی اچھی سی کہانی سنائیں۔“

دوسرے بچّوں نے بھی اس کی ہاں میں ہاں مِلائی۔ ابّا جان نے مُسکراتے ہوئے کہا۔ ”بھئی جو کہانیاں مُجھے یاد ہیں، وہ سب تمہیں سُنا دی ہیں۔ اَب تمہاری باری

ہے۔"

"ہمیں تو کوئی بھی یاد نہیں۔" عذرا نے کہا۔

"اچھّا تو پھر مُجھے سوچنے دو۔" ابّا جان بولے۔ شاید کوئی یاد آ جائے۔"

تھوڑی دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔ پھر ابّا جان نے کہا۔ "کہانی تو کوئی یاد نہیں آتی۔ کہو تو آج کی آپ بیتی سُنا دوں۔"

"چلیے آپ بیتی ہی سہی۔" میں نے کہا۔ "بعض سچّی باتیں کہانیوں سے زیادہ دلچسپ ہوتی ہیں۔"

ابّا جان نے کچھ دیر سوچا پھر گلا صاف کر کے بولے: "تمہیں معلُوم ہے کہ تین برس پہلے ملازمت کے سلسلے میں میں کُچھ دِن کراچی میں رہا تھا۔ یہ اُنہی دِنوں کا واقعہ ہے۔ ایک دن رات وقت میں سائیکل پر جا رہا تھا کہ اچانک پیچھے سے آواز آئی۔ "بابو صاحب۔۔۔!" میں نے مُڑ کر دیکھا۔ ایک نوجوان دوڑتا ہوا آ رہا تھا۔ نزدیک آ کر کہنے لگا۔ "بابو صاحب۔۔۔! میں نے آپ کو تکلیف دی۔ معافی چاہتا

ہوں۔ دراصل میں یہ پُوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا یہ سڑک ایمپریس مارکیٹ جاتی ہے؟"

"جی ہاں۔۔۔!" میں نے جواب دیا۔

اُس نے میرا شکریہ ادا کیا اور میں دوبارہ سائیکل پر سوار ہو گیا لیکن ابھی تھوڑی دُور ہی گیا تھا کہ پھر اُس نے آواز دی۔ "بابو صاحب۔۔۔ ذرا ٹھہریے!" مُجھے پھر ٹھہرنا پڑا۔ نزدیک آکر اُس نے کہا۔ "میں اِس شہر میں اجنبی ہوں۔ اگر آپ کو تکلیف نہ ہو تو تھوڑی دور میرے ساتھ چلیے۔ آپ بھی شاید اُدھر ہی جا رہے ہیں۔" میں رضامند ہو گیا کیونکہ مُجھے اِتنی جلدی نہ تھی۔

وُہ چہرے سے ایک بھولا بھالا دیہاتی معلُوم ہوتا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی گٹھڑی تھی اور دُوسرے میں ڈنڈا۔ راستے میں اُس نے کوئی بات نہ کی۔ ہم جلد ہی ایمپرس مارکیٹ کے نزدیک پہنچ گئے۔

یہاں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ ہم اپنے خیالوں میں مگن جا رہے تھے۔ سڑک پر آمد و رفت کم تھی کیونکہ سردیوں کے دِن تھے اور رات کے نو بجے کا وقت۔

اچانک میری نظر ایک چمکیلی سی چیز پر پڑی جو سڑک کے بیچوں بیچ پڑی تھی میں ابھی دیکھ ہی رہا تھا کہ اِتنے میں ایک نوجوان بڑی تیزی سے آیا اور وہ چیز اس طرح اُٹھا کر لے گیا جیسے چیل زمین سے گوشت کا ٹکڑا اُٹھاتی ہے۔ میں تو حیرت سے اُسے دیکھتا ہی رہ گیا مگر میرے ساتھی نے شور مچا دیا۔ "بابو جی! وُہ چور کیا چیز اُٹھا کر لے گیا؟ ہمیں اُس کا تعاقب کرنا چاہیے۔ ضرُور کوئی قیمتی چیز ہو گی۔"

مَیں نے کہا۔ "کرنا تو چاہیے مگر اب تو وُہ کہیں کا کہیں پُہنچ چُکا ہو گا۔"

"آپ مُجھے سائیکل پر بٹھائیں اور اُس دائیں طرف والی گلی میں مُڑ جائیں۔ وُہ اُدھر ہی گیا ہے۔ ہمارے پاس سائیکل ہے۔ ہم ضرُور اُسے پکڑ لیں گے۔"

میں نے اُس کو سائیکل پر بٹھایا اور اُس گلی میں داخل ہو گیا۔ یہ گلی سڑک سے بھی زیادہ سُنسان تھی۔ ہم سیدھے چلتے گئے۔ اچانک اجنبی نے جوش بھری آواز میں کہا۔ "وُہ رہا، بابو صاحب"!

وُہ شخص بڑی بے فکری سے ٹہلتا ہوا جا رہا تھا۔ میں نے اُس کے قریب جا کر سائیکل روکی۔ ہمیں دیکھ کر وُہ گھبرا گیا۔ اجنبی نے اس لڑکے سے کہا:

"وُہ سونے کی ڈلی کہاں ہے؟"

"کون سی ڈلی؟" نوجوان نے جواب دیا۔

"وہی جو تم سڑک سے اُٹھا کر بھاگے ہو۔ تمہیں ہم دونوں نے دیکھا ہے اور اچھّی طرح پہچانتے ہیں۔" اجنبی بولا۔

کُچھ دیر تک تو وُہ نوجوان اصرار کرتا رہا کہ اسے کسی ایسی ڈلی کے بارے میں معلوم نہیں۔ لیکن آخر کُچھ دیر کے بعد اقرار کر لیا کہ اُسی نے وہ سونے کی ڈلی اُٹھائی ہے۔

"میرا خیال ہے اسے پولیس کے حوالے کر دینا چاہیے تا کہ وُہ اس کے اصل مالک کو تلاش کر کے اسے اس کی کھوئی ہوئی امانت واپس دلائے۔" اجنبی بولا۔

"اگر آپ مجھے کُچھ عنایت کریں تو میں یہ ڈلی آپ کے حوالے کر دوں گا۔ پھر آپ چاہیں تو اسے خود رکھ لیں، چاہیں تو اسے پولیس کے حوالے کر دیں۔" نوجوان بولا۔

"میں تو ایک غریب آدمی ہوں۔ میرے پاس تو سفر کے خرچ کے علاوہ کوئی رقم نہیں۔ بابو صاحب! اگر آپ کے پاس کچھ نقد رقم ہو تو اتنی مالیت کا سونا آپ کے لیے کافی فائدہ مند ہو گا۔" اجنبی نے کہا۔

میں نے دِل ہی دِل میں سوچا کہ یہ ہماری ملکّیت نہیں ہے اور اس پر ہمارا کوئی حق نہیں۔ اسے اس کے اصل مالک کو ملنا چاہیے۔ لیکن شیطان نے ورغلایا کہ اس ڈلی کی مالیت کافی معلوم ہوتی ہے اور اسے بیچ کر میں کافی چیزیں خرید سکوں گا۔ اتنی دیر میں اجنبی نے وہ ڈلی نوجوان کے ہاتھ سے لے کر غور سے دیکھنا شروع کیا۔

مُجھے کشمکش میں دیکھ کر اجنبی بولا۔ "بابو صاحب! سوچنے کی کیا بات ہے۔ یہ ڈلی یقیناً خالص سونے کی ہے۔ میں سُنار کے ساتھ کام کرتا رہا ہوں۔ اصلی اور نقلی میں فرق کو پہچانتا ہوں۔ کافی بھاری ٹکڑا ہے۔ اس کی مالیت کم از کم چند ہزار روپے تو ہو گی۔ اگر آپ کے پاس کُچھ نقدی ہے تو میں اس نوجوان کو منانے کی کوشش کرتا ہوں۔"

میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور صرف پانچ روپے جیب میں پائے۔ میں نے یہ

روپے اجنبی کے ہاتھ میں رکھ دیے اور کہا:

"میرے پاس تو یہی روپے ہیں۔"

اجنبی دوست نے وہ روپے مُجھے واپس دیتے ہوئے کہا۔

"بابو صاحب! یہ رقم تو بہُت کم ہے۔ آپ سوچ لیں۔ یہ سونے کی ڈلی بہت قیمتی ہے۔"

یہ کہہ کر اُس نے سر سے پاؤں تک مُجھے دیکھا اور پھر خوش ہو کر بول۔ "آہا! بابو صاحب! آپ بہت خوش قسمت ہیں۔ آپ کے پاس گھڑی بھی تو ہے۔ یہ کیوں نہیں دے دیتے۔"

مُجھے سونے کا لالچ تھا۔ میں نے اپنی نئی گھڑی اُسے اتار کر دے دی۔ میرا اجنبی دوست یہ چیزیں اُس نوجوان کے پاس لے گیا اور تھوڑی دیر بعد واپس آ کر افسردہ لہجے میں کہنے لگا۔ "بابو صاحب وہ نہیں مانتا۔ آپ کی انگلی میں جو انگوٹھی ہے یہ بھی دے دیں۔ آپ اس سونے سے بیس گنا اچھّی بنوا لیں۔ اور اس نے

میرے ہاتھوں میں سونے کی ڈلی تھما دی۔ خُوشی کے مارے میرا دَل بلّیوں اُچھلنے لگا۔ میں نے اپنی انگوٹھی اُسے دے دی اور سونے کی ڈلی جیب میں ڈال لی۔

وُہ اُسے انگوٹھی دے کر جلدی سے واپس آ گیا۔ کُچھ دُور چل کے اجنبی کی منزل آ گئی اور ہم اپنی اپنی راہ چل نکلے۔ میں اس سونے کو پا کر خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا۔ گھر آتے ہی میں نے اُسے ٹرنک میں کپڑوں کے نیچے چھپا دیا اور تمام رات اُس کو خرچ کرنے کے منصوبے بنارا رہا۔ خدا خُدا کر کے سویرا ہوا اور میں دفتر گیا اور واپس آتے ہی وُہ سونے کی ڈلی لے کر جوہری کی دُکان پر گیا۔ جوہری نے اُسے کسوٹی پر گھِسا اور ایک دم ہنس پڑا۔

میں نے ذرا غصّے سے کہا "سیٹھ صاحب! آپ بے فکر رہیں، یہ خالص سونا ہے۔"

"مگر۔۔۔ مگر۔۔۔" جوہری نے رُکتے ہوئے کہا۔

"مگر کیا۔۔۔؟" میں نے پوچھا۔

"یہ سونا نہیں؟" وُہ بولا۔

"کیا کہا؟ یہ سونا نہیں؟" میں نے کُرسی سے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں یہ سونا نہیں بلکہ ملّمع کیا ہوا پیتل ہے۔" جوہری نے کہا۔

"سیٹھ صاحب! ذرا غور سے دیکھیے۔ شاید آپ کو پہچاننے میں غلطی ہوئی ہو۔" میں نے اصرار کیا۔

"جی میں بالکل پُراعتماد ہوں کہ یہ سونا نہیں ہے۔" وُہ بولا۔ "اگر آپ بُرا نہ منائیں تو کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کو یہ ٹکڑا کیسے ہاتھ آیا؟"

میں نے اُسے ساری کہانی شروع سے آخر تک سُنائی۔ میری کہانی سُننے کے بعد وُہ خوب ہنسا اور کہنے لگا۔

"لگتا ہے آپ کے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ وہ اجنبی اور نوجوان شاید ایک دوسرے کو جانتے تھے اور آپ پر ایسا ظاہر کیا جیسے کہ وہ انجان ہوں۔ اُن نوسربازوں نے آپ کو یہ یقین دلایا کہ یہ ڈلی خالص سونے کی ہے اور آپ کے دل میں اسے حاصل کرنے کا لالچ پیدا کیا۔ آپ ان کی چال میں آگئے اور اپنی قیمتی اشیاء ان

کے حوالے کر دیں۔"

اب آہستہ آہستہ مجھے بھی ان جی چال سمجھ میں آگئی اور میں اپنے آپ پر ملامت
کرتا گھر کو روانہ ہوا۔